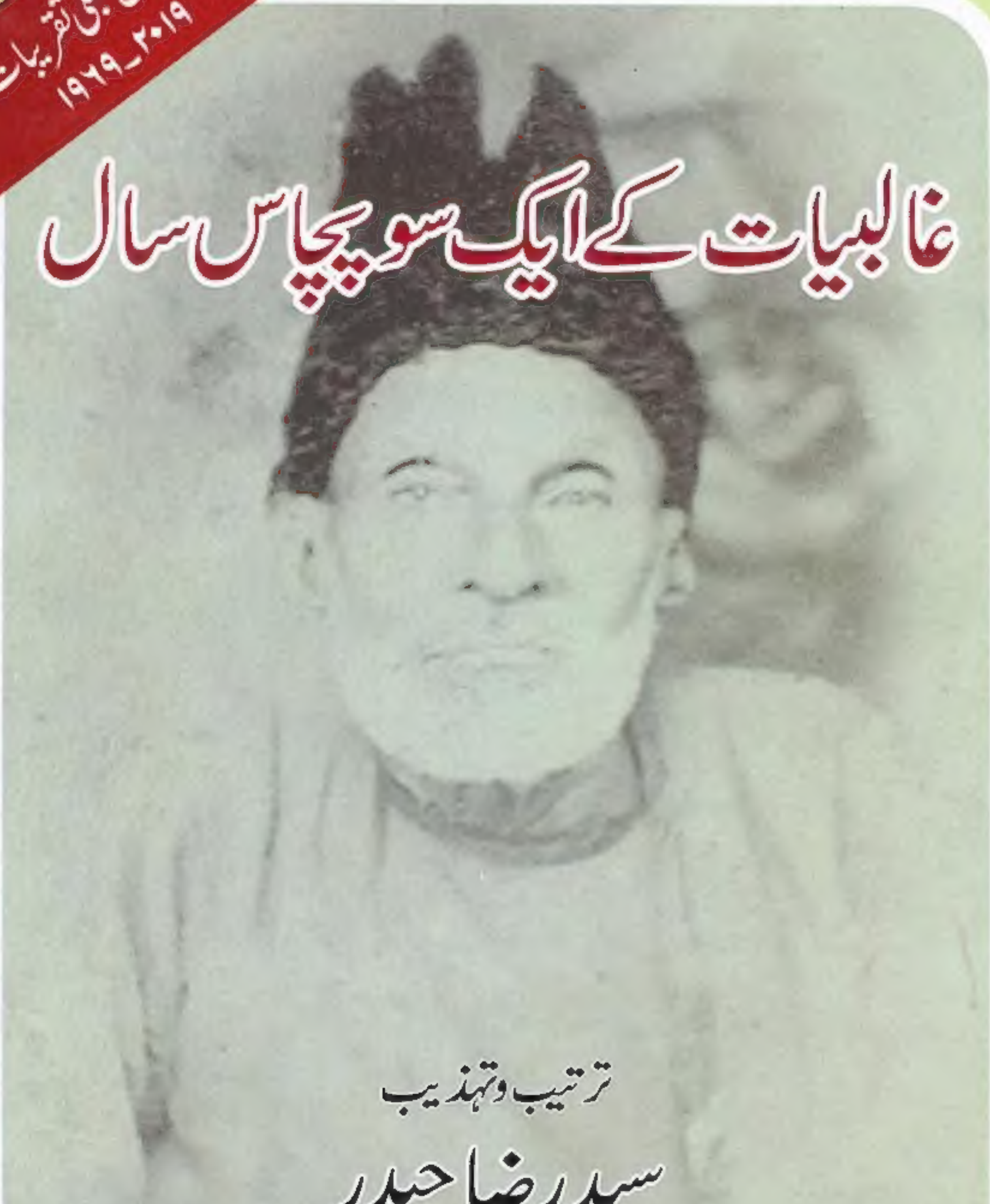
گولڈن جبلی تقریبات
۱۹۶۹_۲۰۱۹

غالبیات کے ایک سو پچاس سال



ترتیب و تہذیب

سید رضا حیدر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

غالبیات کے ایک سو پچاس سال

غالبیات کے ایک سو پچاس سال

ترتیب و تہذیب

سید رضا حیدر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

Ghalibiyat Ke ek sau pachas Saal

By

Syed Raza Haider

ISBN : 978-81-943419-4-9

بہ اہتمام : ڈاکٹر ادریس احمد

اشاعت : ۲۰۱۹

مطبوعہ : اصیلا آفسٹ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ

ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۔۲

www.ghalibinstitute.org-- E-mail: ghalibinstitute@gmail.com

فہرست

پیش لفظ

’عیار الشعرا‘ اور ’عمدۂ منتخبہ‘ سے لے کر ’یادگار غالب‘ اور یادگار غالب سے لے کر تا حال غالب سے متعلق جس اہتمام و تفصیل سے لکھا گیا ہے اردو کے کسی اور شاعر کے لیے نہیں لکھا گیا۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی ادیب، نقاد یا مؤرخ ہو جس نے غالب سے متعلق اپنے خیالات پیش نہ کیے ہوں۔ ’یادگار غالب‘ کے بعد سے آج تک غالب تنقید و تحقیق جن ارباب قلم کی سرپرستی میں مصروف سفر رہی ہے ان میں قابل ذکر نام کی بھی خاصی طویل فہرست ہے۔ حالی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبداللطیف، شیخ اکرام، مہر، طباطبائی، حسرت، سہا، خلیفہ عبدالحکیم، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، احتشام حسین، خورشیدالاسلام، نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ وغیرہ کی تحریروں نے غالبیات سے متعلق نئے فکری زاویے پیش کیے اور غالب تنقید کا معیار بلند کیا۔ شاعری کے علاوہ غالبیات کے دوسرے پہلو مثلاً خطوط نگاری، تاریخ نگاری اور لغت نگاری جیسے موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی زاویوں سے نہایت کارآمد بحثوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، نذیر احمد، مہیش پرشاد، مالک رام، کالی داس گپتا رضا، حنیف نقوی، خلیق انجم جیسے محققین نے تحقیق و تدوین کے تعلق سے نہایت اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی غالبیات سے متعلق بہت سا لٹریچر جمع ہو چکا ہے، ظاہر ہے ان میں ساری باتیں کام کی نہیں بہت کچھ تحصیل حاصل، طول بے جا اور تکرار محض کے زمرے میں آتا ہے۔ غالب کی 150 ویں برسی

ایک صحیح وقت ہے کہ ہم غالبیات سے متعلق تحقیقی وتنقیدی مباحث کا از سر نو جائزہ لیں، لہٰذا غالب انسٹی ٹیوٹ نے ۱۶۔۱۷ر فروری ۲۰۱۹ کو 'غالبیات کے ایک سو پچاس سال' کے موضوع پر دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد کیا، پیش نظر کتاب سمینار میں پیش کیے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ امید ہے ادبی حلقوں میں اس کتاب کو پذیرائی حاصل ہوگی۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

شریف حسین قاسمی

دیوان غالب دہلوی، مطبوعہ ایران

"دیوان دہلوی: مشتمل بر غزلیات و رباعیات فارسی" احیائے کتاب، دفتر نشر میراث مکتوب سے پہلی بار ۱۹۹۳ء/۱۳۷۷ش میں شائع ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن حائری نے اس پر ایک مقدمہ لکھا ہے اور تصحیح و تحقیق کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اسی اشاعت کا ایک اجمالی تعارف مقصود ہے، لیکن اس سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عام طور پر ہم ہندستانیوں کا یہ خیال رہا ہے کہ ایرانی ہمارے فارسی سرمایے پر وہ توجہ نہیں کرتے جس کا یہ حقدار اور سزاوار ہے، بیس پچیس برس پہلے تک یہ بات صحیح تھی پر اب حالات بدل گئے ہیں۔ ایرانی فضلا نے حقیقت حال کا صحیح اندازہ لگایا اور ہمارے فارسی سرمایے کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا ہے۔ ہندستان کے ایرانی شعرا و ادبا اور خود ہندستانی فارسی شعرا و ادبا کا کلام اب ایران میں توجہ کا مرکز قرار پا چکا ہے۔ دانش نامہ زبان و ادب فارسی در شبہ قارہ لکھا جا رہا ہے۔ اس کی کئی جلدیں نہایت آب و تاب سے فرہنگستان زبان و ادب فارسی، تہران نے شائع کردی ہیں۔ اس کی تالیف و تصنیف میں پہلے ہمارے فارسی دانشوروں نے نہایت سرگرمی سے حصہ لیا تھا جس کی وجہ سے اس دانشنامہ کی چند اوایل کی جلدوں میں ہندستانی فضلا کے کثرت سے مقالات شامل ہیں۔ اس سرگرمی میں فی الحال ہم لوگ اب حصہ نہیں لے رہے، جو باعث افسوس ہے۔ غالب دہلوی کے معنوی استاد عبدالقادر بیدل، فارسی کے وہ ہندستانی

شاعر و ادیب ہیں، جن کے کلام کی اس وقت ایران میں بڑی دھوم ہے، فارسی کے جدید استاد شعرا بیدل سے تاثر پذیری کو اپنا ایک امتیاز سمجھتے ہیں، خاص طور پر بیدل کی انوکھی اور اچھوتی تراکیب کے وہ شیدائی ہیں۔ بیدل کی تمام کتابیں ایران سے شائع ہو چکی ہیں۔ رامپور رضا لائبریری میں بیدل کا وہ مکمل دیوان محفوظ ہے جو بیدل نے اپنے شاگرد بندرابن داس خوشگو کو دیا تھا، اس کا عکسی ایڈیشن نہایت شاندار ایران سے شائع ہو چکا ہے، اس ناچیز نے بھی بیدل کا ایک انتخاب غزلیات مرتب کیا تھا جس کے حواشی پر خود بیدل نے اپنے خط میں بعض غزلیات کا اضافہ کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن تہران سے چند سال قبل منظر عام پر آیا تھا۔ ایران میں بنیادِ بیدل کی تشکیل عمل میں آچکی ہے، یہ فاؤنڈیشن عرسِ بیدل کے نام سے بیدل پر بین الاقوامی کانفرنسوں کا انعقاد کرتی ہے اور خود ہندستان میں بھی فعال ہے۔ خود غالب انسٹی ٹیوٹ کے ایرانی علما و فضلا سے قریبی تعلقات ہیں۔ غالب پر سالانہ بین الاقوامی سمیناروں میں اوائل میں ایرانی اساتذہ اور دانشمندوں نے بارہا شرکت کی اور غالب پر اپنے اپنے علمی و تحقیقی مقالات پیش کیے ہیں۔ جو غالب نامے کی مختلف اشاعتوں میں شامل ہیں۔ ان سمیناروں میں شرکت کرنے والوں میں استاد مہدی محقق، استاد جعفر شہیدی، استاد ڈاکٹر محمد نصیری وغیرہ جیسے ایران کے مشاہیر شامل رہے ہیں۔

راقم کو یاد ہے کہ تہران، ایران میں ایک بین الاقوامی سمینار کے ساتھ ہی، اصفہان یونیورسٹی میں غالب پر ایک روزہ سمینار منعقد کیا گیا تھا، انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب اور اس وقت کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی صاحب اس میں مدعو تھے، جو کسی وجہ سے اس میں شرکت نہیں کر سکے۔ راقم حروف کو اس میں شرکت اور غالب پر ایک مقالہ پیش کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس سمینار میں اصفہان یونیورسٹی کے فارسی کے متعدد اساتذہ نے غالب پر مقالات پیش کیے تھے جن سے بہر حال یہ احساس ہوا کہ ایرانی غالب اور اس کے آثار سے بخوبی واقف ہیں۔

جہاں تک راقم معلوم کر سکا ہے، ڈاکٹر حائری ایسے واحد ایرانی استاد ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ غالب دہلوی پر علمی، ادبی اور تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ آپ نے علمی مجالس میں غالب کا تعارف کرایا ہے۔

رندِ ہند کے عنوان سے آپ نے غالب پر ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالہ پڑھا، ایرانی علمی رسائل میں غالب پر مضامین شائع کیے ہیں۔ ''غالب دہلوی'' عنوان سے ان کا ایک مقالہ مجلۂ

زبان وادب میں، گلگشتی در دیوان غالب دہلوی، مجلۂ آئینۂ میراث میں، مقالہ سومنات خیال مجلہ آشنا میں شائع کرائے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر حائری نے سومناتِ خیال کے نام سے غالب کے فارسی قصائد شائع کیے ہیں، میخانہ آرزو، ڈاکٹر حائری کی غالب کے احوال و آثار پر ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اور دیوان غالب غزلیات و رباعیات کی ترتیب و تصحیح ان کا ایک وقیع علمی و تحقیقی کام ہے۔

راقم اس وقت دیوان غزلیات غالب کا ایک اجمالی تعارف پیش کرنا چاہتا ہے۔ غالب کے دیوان کی اس اشاعت سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر حائری ترتیب و تحقیق کے معقول طریقوں سے بخوبی واقف اور ہندستان میں فارسی زبان و ادب کی اہمیت اور امتیازات کے قائل تھے۔ ڈاکٹر حائری نے اس اشاعت پر ۴۱ صفحات کا ایک جامع مقدمہ لکھا ہے جو غالب کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

بود غالب عندلیبی از گلستانِ عجم　　من ز غفلت طوطیِ ہندوستان نامیدمش

یعنی حائری غالب کی فارسی زبان اور ان کی فکر کو ایرانی فارسی ادب ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس مقدمے میں حائری نے فارسی شاعری کا دور بدور نہایت اجمالی جائزہ لیا ہے اور ہندستان میں انیسویں صدی کے فارسی شعرا میں غالب کو سرآمد شاعر قرار دیا ہے۔ غالب کے احوال زندگی جو عام طور پر معلوم ہیں، بیان کیے ہیں۔ وہ ہندستان میں ملا عبدالصمد اور غالب کا ان سے اشنان علم کرنے کے بارے میں تحقیقات سے واقف نہیں، اس لیے وہ عبدالصمد کے وجود کی تصدیق کرتے ہیں اور تشیع کی طرف غالب کے میلانِ طبع کو ملا عبدالصمد کی تربیت کا نتیجہ گردانتے ہیں۔ غالب کے مختلف آثار کے نام لیتے ہیں، غالب کے قصاید کی خصوصیات بیان کرتے ہیں، طویل قصاید میں تجدید مطلع کو غالب کی ایک خصوصیت سمجھتے ہیں۔ غالب کی فارسی غزل کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی کل تعداد ۳۴۳ ہے اور ان میں کل ۳۶۲۲ شعر ہیں۔ سب سے مختصر غزل ۶ شعر کی اور سب سے طویل ۲۰ ابیات پر مشتمل ہے ورنہ پیشتر غزلیں ۱۱ شعر کی ہیں۔ ۱۵۔۱۶ اشعار کی غزلیں کم ہیں غالب کی غزلیات عین روانی و سادگی کے ساتھ شوکت اسلوب کی ترجمان ہیں، ان میں بلند آہنگی ہے، خیال انگیزی ان کا ایک دوسرا وصف ہے، ادبی اصطلاحات، نادر استعارے اور تشبیہات نے انھیں امتیاز بخشا ہے۔ حائری صاحب نے غالب کے اردو آثار کا بھی مختصر تعارف کرایا ہے، لیکن غالب کے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں اور ظاہر ہے غالب

کے بیان پر خوش ہوتے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ بگذراز مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

فارسی بیں تابدانی کاندر اقلیم خیال مانی و ارژنگم و آن نسخۂ ارتنگ منست

غالب نئے مضامین، اچھوتے خیالات اور معانی کا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں نقش، آئینہ، طرح اور رنگ کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ اور غالب رنگوں کے بکھر جانے سے بدیع شاعرانہ خیالات ایجاد کرتا ہے۔ حسن تعلیل نے اس کے خیال کو شور انگیز بنا دیا۔

غالب کے اشعار موسیقی سے سرشار ہیں۔ وہ مذہب کے ظاہری آداب و رسوم کا قائل نہیں۔ صرف غزلیات ہی میں نہیں بلکہ دوسری اصناف سخن میں بھی تصوف و عرفان کا رنگ جھلکتا ہے۔ خلقتِ انسان کے راز کی عظمت کے بارے میں غالب کا ہنگامہ خیز عقیدہ اس شعر میں بیان ہوا ہے:

صد قیامت بگدازند و بہم آمیزند تا خمیرِ دل ہنگامہ گزینِ تو شود

سو قیامتوں کو پگھال کر بہم آمیز کیا گیا اور اس سے انسان کے دل کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔

حائری صاحب نے غالب کی فارسی شاعری پر جن استاد شعرا کا اثر نظر آتا ہے، اور جن کا خود غالب نے بھی ذکر کیا ہے، اس پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اسی طرح غالب کے کلام میں ایرانی اساطیر و زردشتی روایات کا ذکر بھی کیا ہے اور اسے غالب کی ایرانی تہذیب سے دلبستگی کو وجہ بتایا ہے۔ مرتب نے اپنے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند ہے، حوالوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر حائری نے غالب کی فارسی غزلیات کی ترتیب و تصحیح میں درج ذیل پانچ نسخوں سے راہنمائی حاصل کی ہے:

نسخۂ دہلی، نسخۂ نولکشور، مجلس ترقی ادب اردو، لاہور میں موجود ایک نسخہ، اشاعت لاہور، کلیات مطبوعہ لکھنؤ، ڈاکٹر حائری نے غالب کی ان مطبوعات کے سال اشاعت نہیں دیے۔ اس لیے ان کا تعین مشکل ہے، وہ غالباً یہ حقیقت نہیں جانتے کہ نولشکور پریس سے غالب کے مختلف آثار مختلف اوقات میں شائع ہوئے ہیں لیکن اشاعتیں ایک حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مرتب نے اختلاف نسخ کی نشاندہی حواشی میں کی ہے۔ حائری صاحب کی اشاعت میں ۳۳۴ غزلیں اور ۱۱۳ رباعیات ہیں۔ کلیات غالب (فارسی) مرتبہ سید مرتضی حسین فاضل لکھنوی مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور (جون ۱۹۶۷) غالباً سب سے مکمل اشاعت ہے۔ اس میں

بھی غزلیات کی تعداد ۳۳۴ ہے، لیکن رباعیات ۱۳۲ ہیں، یعنی ڈاکٹر حائری کے مرتبہ دیوان میں ۹ رباعیات کم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر حائری ''اپنے مآخذ میں'' نسخہ ایست کہ از آن مجلس ترقی ادب اردو لاہور است'' کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی فاضل لکھنوی صاحب کی مرتبہ کلیات ہے۔

راقم کی ناقص رائے میں، اس اشاعت میں جو پانچ ضمیمے شامل ہیں، وہ خاصہ کی چیز ہیں۔ پہلے ضمیمے میں ان شعرا کے نام درج ہیں جن کا ذکر غزلیات میں آیا ہے اور ان پر مختصر یادداشتیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ غالب نے اپنی غزلیات میں سب سے زیادہ ۱۳ مرتبہ ظہوری شیرازی کا ذکر کیا ہے۔ غالب اپنے اشعار میں ظہوری کا نہایت ادب سے ذکر کرتے ہیں، ڈاکٹر حائری نے وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جن میں ان شعرا کا نام لیا گیا ہے۔

دوسرا ضمیمہ لفظ نقش کی غزلیات میں تعداد کی نشاندہی ہے۔

لفظ نقش غزلیات میں ۴۳ بار تکرار ہوا ہے۔ تیسرا ضمیمہ لفظ 'طرح' کی تعداد، یہ لفظ غزلیات میں ۲۴ بار ہے۔ چوتھے ضمیمے میں رنگ، یک رنگی اور لفظ رنگ سے دوسری تراکیب ۷۰ بار استعمال ہوئی ہیں۔ پانچویں ضمیمے میں لفظ آئینہ کی تعداد بتائی گئی ہے جو ۶۷ ہے۔ مرتب نے وہ اشعار بھی نقل کر دیے ہیں جن میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ کام کمپوزر کی وجہ سے نسبتاً آسانی سے انجام دیا جا سکا ہے، لیکن غالب پر تنقیدی کام کرنے والوں پر شاید یہ پہلی بار کھلا ہے کہ غالب نے صرف اسلوب و فکر ہی کی حد تک بیدل سے استفادہ نہیں کیا تھا، بلکہ بیدل کے بعض ایسے خاص الفاظ بھی اخذ کر لیے تھے جو اس کے کلام میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ بیدل کو ایرانی ''شاعرِ آئینہ'' کہتے ہیں، استاد شفیع کدکنی نے تو بیدل پر اپنی تنقیدی کتاب کا نام ہی 'شاعرِ آئینہ ہا' رکھا ہے اور ان تمام اشعار سے بحث کی ہے جن میں لفظ آئینہ استعمال ہوا ہے۔

ڈاکٹر حائری نے دیوان غالب محنت اور دلجمعی سے مرتب کیا ہے، جس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر حائری نے تہران یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کیا تھا اور علامہ طباطبائی یونیورسٹی میں فارسی پڑھاتے تھے، دو چار سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔

نسیم احمد

غالب کا ایک فارسی شعر اور اُن سے منسوب چند دوسرے اشعار

ایک اجمالی گفتگو

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ من است

یہ شعر پڑھ کر یا سنا کر عام طور پر طلبہ یا سامعین کو باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ غالب بنیادی طور پر فارسی کے شاعر وادیب تھے محض تفننِ طبع کی خاطر وقتاً فوقتاً اردو میں شعر کہہ لیا کرتے تھے اور بس۔ یہ وطیرہ صرف فارسی اور اردو کے علماء کا ہی نہیں ہے بلکہ بعض ہندی کے دانشور جنھیں اردو فارسی کی شد بد ہے وہ بھی اس شعر کے حوالے سے غالب کی فارسی دانی کا سکہ جمانے یا اردو سے ان کی عدم دلچسپی کو واقعہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اصلاً انھوں نے اردو میں طبع آزمائی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور تقریباً بیس برسوں تک ریختے میں شعر کہتے رہے۔ اس دوران میں ریختہ کے نامور شعرا میر درد، سودا، ناسخ، آتش وغیرہ کے دواوین سے اخذ واستفادے کے ساتھ فارسی شعرا مثلاً بیدلؔ، نظیری، صائب وغیرہ کے دواوین بھی ان کے زیر مطالعہ رہے۔ تقریباً ان دو دہائیوں کی مشق ومزاولت اور محنت ومطالعہ کے بعد وہ فارسی شاعری کی جانب متوجہ ہوئے، گویا کہ بیس برسوں تک مشق ومزاولت کا یہ طویل عرصہ اور

فارسی شعرا کے کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ پیش خیمہ تھا ان کی فارسی شاعری کی ابتدا کا۔

غالب کی فارسی نثر کے ابتدائی نمونے دیباچہ ہائے دیوانِ ریختہ گلِ رعنا اور بعض دوسری کتابوں کے علاوہ اردو کتابوں پر لکھی گئی تقاریظ میں بھی ملتے ہیں جو تمام تر انھوں نے فارسی ہی میں لکھی ہیں۔ علاوہ ازیں خطوط بھی وہ فارسی ہی میں لکھتے رہے اور برعکس اردو شعر گوئی کے، نثر میں اپنی ادبی زندگی انھوں نے فارسی سے شروع کی۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا کہ اردو زبان رنگینی عبارت، حسن بیان اور انشا پردازی کی اس قدر متحمل نہیں ہے جتنی کہ فارسی۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو میں فارسی جیسی عبارت آرائی مفقود ہے۔ لیکن زندگی کے آخری دنوں میں جب قویٰ میں طاقت نہ رہی اضمحلال کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے نیز پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی سکت باقی نہ رہی تو انھوں نے فارسی انشا پردازی تقریباً ترک کر دی اور ریختے کی زبان اردو جسے اس وقت تک زبان مروج کا مقام مل چکا تھا، کو اپنے مکتوبات اور مراسلات کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ اپنی اس تبدیلی کا ذکر انھوں نے بار بار اپنے خطوں میں کیا ہے۔ منشی نول کشور کو لکھتے ہیں:

''اکنون کہ دل از ناتوانی سگالش برنمی تابد، کار بر خود آساں کردہ ام و ہر چہ می باید نبشت، در اردو می نویسم۔''

[اب دل فکری و ذہنی کمزوری کی وجہ سے آمادہ نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس لیے میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے جو کچھ ضبط تحریر میں لانا چاہیے اسے میں اردو میں لکھ رہا ہوں۔]

اپنے ایک اور خط میں مولانا عباس رفعت کو بھی یہی عذر پیش کرتے ہیں:

''از دیر باز نبشتن نثر بہ پارسی زبان آئینِ من نیست۔ نامہ ہا یکدست بہ اردو نبشتہ می شود۔''

[بہت دنوں سے فارسی میں نثر تحریر کرنا ترک کر چکا ہوں اس لیے تمام خطوط اردو میں لکھے جا رہے ہیں۔]

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کی مادری یعنی گھر کی زبان اردو تھی اور فارسی کی معلومات کُلی اکتسابی۔ یہ علاحدہ بات ہے کہ بلا شک وشبہ ان دونوں زبانوں کے وہ بڑے پارکھ اور عالم تھے۔ بعض اصحاب کا یہ کہنا کہ فارسی ان کی پدری زبان تھی اور اردو مادری محض جملہ ہے اس

سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ایک بات اور آخری دور کی اپنی اس نئی پسندیدہ روش سے قطعِ نظر اُن کے ایسے احباب بھی ہیں جنھیں انھوں نے کبھی بہ زبانِ اردو کوئی خط نہیں لکھا۔ ان کے نام ہیں:

شیخ امام بخش ناسخ، مولانا فضلِ حق خیرآبادی، حسام الدین حیدر خاں، مرزا علی بخش خاں، رائے چھج مل، مولوی محمد علی خاں، صدر امینِ باندا، مرزا احمد بیگ خاں طپاں، نواب علی اکبر خاں طباطبائی، مرزا ابوالقاسم خاں، مولوی سراج الدین احمد اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔

چند تصویرِ بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غالب کے مروج دیوان میں اسی زمین میں چھ شعر کی ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے شوق ہر رنگ، رقیبِ سروساماں نکلا۔ اس کے مقطع میں غالب تخلص ملتا ہے۔ نسخۂ عرشی اور کالی داس کے مرتبہ دیوان کامل میں اس زمین کی ایک اور غزل جو آٹھ شعروں پر مشتمل ہے، اسد تخلص کے ساتھ نظم ہوئی ہے۔ منقولہ بالا شعر اِن دونوں غزلوں میں موجود نہیں۔ غالب کی زندگی میں چھپے ہوئے دواوین میں بھی یہ شعر نہیں ملتا، نہ ہی دیوانِ غالب کے معلوم شدہ قلمی نسخوں میں یہ کسی غزل کا حصہ ہے اور نہ شعرِ مفرد کے طور پر ہی نقل ہوا ہے۔ نظامی پریس بدایوں نے ۱۹۱۵ تا ۱۹۲۷ء کے درمیان دیوانِ غالب کے چھ ایڈیشن شائع کیے، پہلا اور دوسرا ایڈیشن اس شعر کے اندراج سے خالی ہے مطبع کے تیسرے ایڈیشن میں نظامی مرحوم نے دیوان کے آخر میں قدیم اور نو دریافت نسخوں کا منتخب کلام کے تحت اسے پہلی بار شامل کیا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ:

''یہ شعر اکثر لوگوں کی زبان پر ہے لیکن اس کے اصل مصنف کے نام سے لوگ ناآشنا ہیں۔ بعض اسے میر تقی میر کا بتاتے ہیں، بعض مرزا غالب کا۔ لیکن کلیاتِ میر میں اس کا پتہ نہیں، نہ دیوانِ غالب میں ہے۔ لیکن حضرت شوکت بلگرامی نے اس شعر کی بابت اردوے معلّٰی، علی گڑھ، مطبوعہ ستمبر ۱۹۱۰ میں اپنے ایک بزرگ کے حوالے سے لکھا تھا کہ اپنی اس مشہور غزل ''قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا'' میں بعد طبعِ دیوان مرزا نے اس شعر کا اضافہ کیا تھا۔ عجب نہیں کہ حضرت شوکت کا یہ بیان صحیح ہو، کیوں کہ اس شعر کے تیور بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرزا جیسے قادرالکلام شاعر کے قلم سے نکلا ہے۔'' راقم الحروف کو بھی یہ شعر میر تقی کے نام سے کہیں نہیں ملا نہ

ہی کسی دانشور تو کجا کسی خواندہ شخص کی زبان سے بھی یہ شعر میرؔ کے نام سے سنا گیا۔ البتہ بعض علم دوست اور غالب سے عقیدت رکھنے والے حضرات کی زبان سے سنا گیا ہے اور ہنوز یہ روایت زندہ ہے۔ نظامی پریس کے علاوہ بعد کے متعدد ایڈیشنوں میں اس شعر کو غالب کے نام سے جگہ دی گئی ہے لیکن یہ انتساب صریحاً غلط ہے۔

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

پروفیسر یوسف حسین خاں نے ۱۹۴۹ میں اردو غزل کے نام سے ایک کتاب شائع کی کتاب کی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ انھوں نے کتاب میں غالب کے نام سے نقل کیا ہے۔

دراصل یہ شعر غالب کا نہیں بلکہ ان کے بڑے معاصر شاعر مومن خاں مومنؔ کی تخلیق ہے۔ اس غزل کا مقطع تو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے:

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

وہ آئیں ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ڈاکٹر مسیح الزماں مرحوم نے حرف غزل کے نام سے ایک مختصر سی کتاب تیار کی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے محبوب کے لیے غزلوں میں مذکر فعل کے استعمال کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

پہلی قسم میں صاف صاف معشوق کا جنس اناث سے تعلق ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ دوسری قسم ایسے اشعار کی ہے جس میں معشوق کی جنس کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور وہ یکساں طور پر عورت اور مرد دونوں سمجھے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور منقولہ بالا شعر نقل کر کے اسے غالب سے منسوب کیا ہے۔ لیکن یہ غالب کا شعر نہیں بلکہ اس کے خالق مومن خاں مومنؔ ہیں۔

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد زباد صبح
در کار زندگی صفتِ سنگ خارہ ایم

مشہور ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر نے اپنی نظموں غزلوں اور رباعیوں کو ''جاوداں'' کے نام سے شائع کیا تو منقولہ بالا شعر کو اپنی کتاب کا سرنامہ بنایا اور اسے غالب سے منسوب کیا اور جب ڈاکٹر محمد حسن نے ہفتہ وار رسالہ آئینہ، دہلی میں 'جاوداں' پر تنقیدی تبصرہ لکھا اس وقت بھی اس

شعر کو غالب سے ہی منسوب کیا گیا۔ کوثر چاند پوری اور نثار احمد فاروقی نے بھی اپنی اپنی تحریروں میں اسے غالب کی ہی تصنیف بتایا ہے۔ لیکن یہ شعر غالبؔ کے دیوان میں نہیں ملتا اور نہ جاں نثار اختر سے قبل کسی نے اسے غالبؔ سے منسوب کیا ہے۔

خدا کا نام گو اکثر زبانوں پر ہے آجاتا
مگر کام اس سے جب چلتا کہ وہ دل میں سما جاتا

یہ شعر اردو حلقوں میں کسی بھی سطح پر کہیں بھی غالبؔ کے نام سے نہ سنا گیا، نہ پڑھا گیا۔

لیکن ہندی کے ایک دانشور نے بہادر شاہ ظفر کے عنوان سے لکھے ہوئے مضمون میں ظفر اقبال اور غالبؔ کے تقابلی مطالعہ میں اس شعر کو غالبؔ کے نام سے نقل کیا ہے۔ لیکن یہ بیان درست نہیں معلوم ہوتا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا
یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
کوچ کر جائیں گے دنیا سے
گر ترا وقتِ سفر یاد آیا

پروفیسر اسلم پرویز مرحوم اپنی تحقیقی کتاب 'انشا اللہ خاں انشاؔ: عہد اور فن' میں حکیم فصیح الدین کی تصنیف 'تذکرۂ نازنینان' کے حوالے سے درج بالا غزل کے تناظر میں لکھتے ہیں کہ یاسمنؔ کے اشعار پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آقا (انشا اللہ خاں) سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ یاسمنؔ کی ایک زمین پر غالبؔ نے بھی طبع آزمائی کی ہے بلکہ اس غزل کے موضوعات کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ انھوں نے اپنے ہاں نظم کر لیا ہے۔ یہ بیان سراسر بہتان طرازی ہے۔ اس سلسلے میں خلیق انجم نے اپنی کتاب 'متنی تنقید' کے نئے ایڈیشن میں بڑی مدلل بحث کی ہے اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ سطور ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

''ایسی چھوٹی بحر میں توارد کا امکان زیادہ رہتا ہے۔ اس کا پورا امکان ہے کہ یاسمن ۱۸۱۷ء (وفات انشا) کے بعد حیات رہی ہوں۔ اگر میرا خیال درست ہے تو انھوں نے ۱۸۲۱ء کے بعد یہ غزل کہی اس لیے سرقے کا الزام یاسمن پر عائد ہوتا ہے، غالب پر نہیں۔ اس سلسلے میں میری دلیلیں یہ بھی ہیں (۱) کہ جس شخص کا فارسی شعرو ادب کا اتنا وسیع مطالعہ ہو، وہ اردو کے کسی معمولی اور گمنام شاعر کا سرقہ نہیں کر سکتا۔ (۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ غالب نے فارسی شعروں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور فارسی شاعروں سے استفادہ کیا ہے لیکن غالباً کسی اردو شاعر کے شعر سے استفادہ نہیں کیا۔ (۳) ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان دونوں اشعار میں جو مضامین بیان کیے ہیں وہ اتنے غیر معمولی نہیں ہیں کہ غالب جیسا عظیم شاعر اُن کے سرقے پر مجبور ہوتا۔''

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

یہ شعر قائم چاند پوری کا ہے۔ غالب نے بے خبر کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ 'میں نے ازراہِ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی۔ غالب کا تصرف کردہ شعر یہ ہے۔

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

اوّل تو یہ شعر غالب کے نام سے کسی دیوان میں موجود نہیں دوئم غالب نے محض تفنّنِ طبع کی خاطر قائم کے شعر کی صورت بدل کر ایک نئی صورت بنا دی ہے۔ بہ ایں لحاظ اس شعر کو غالب کے دیوان میں جگہ نہ دے کر مقدمہ یا حاشیے میں رکھا جانا چاہیے۔

تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

یہ شعر چودھری عبدالغفور کے حوالے سے امتیاز علی خاں عرشی مرحوم نے اپنے مرتبہ دیوان، دیوان غالب میں رکھا ہے۔ خط کے آغاز میں چودھری کے کسی خط کے جواب نہ دینے کے عذر میں غالب لکھتے ہیں۔ 'چودھری صاحب عنایت نامہ سابق بیت، تھا تو خط... الخ

اس بیان سے بالکل واضح نہیں ہوتا کہ یہ شعر خود غالب کا تصنیف کردہ ہے۔ اصلاً اس

کی جگہ دیوانِ غالب نہیں بلکہ خطِ غالب بنام چودھری میں ہونی چاہیے۔

بس کہ فعّالِ مایُرید ہے آج
ہر سِلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ، ہوتا ہے آب ، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ، ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی، واں نہ جا سکے ، یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے ، پھر کیا ؟
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ
سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا لیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے ، یا رب !
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا ؟

نو اشعار کا یہ قطعہ اوّل اوّل اردوے معلّٰی میں علائی کے نام ایک خط کے ساتھ شامل ہوا ہے، غالب کی تصنیف ہونے کا یہاں نہ کوئی اشارہ ہے نہ حوالہ۔ امتیاز علی خاں عرشی نے اس کو اپنے مُرتبہ دیوان میں شامل کیا ہے اور اسے (قیاساً) ۱۸۵۷ کے ہنگامہ کے متعلق بتایا ہے۔ انھی کی کتاب کے حاشیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل (قطعہ) مولانا مہر کی کتاب غالب میں موجود ہے۔ مولانا موصوف نے دو متنی اختلاف بھی اس کتاب کے حاشیے میں نقل کیے ہیں۔ ایک ساتویں

شعر کے مصرعِ اوّل میں ''گاہ جل کر کیا کیے شکوے'' کی جگہ گاہ چل کر...الخ اور دوم آخری شعر میں 'یارب' کی جگہ غالب لکھا ہے۔اس طرح قطعہ کی بجائے یہ بغیر مطلع کی غزل قرار دی جائے گی۔''غالب کے مطالعہ سے یہ بات درست قرار پاتی ہے۔مہر نے اس غزل پر ایک مختصر مگر اپنے طور پر جامع تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ان کی نظر میں یہ اشعار ماتم وعزاداری کی داستانِ غم ہیں۔مولانا مہر نے اِن اشعار کے استناد یا عدم استناد پر کوئی گفتگو نہیں کی ہے۔ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے ان اشعار کو غالب کا کلام خیال کر کے اپنے اپنے یہاں جگہ دے دی ہے۔تیسرے اہم شخص نظامی بدایونی ہیں جنھوں نے دیوانِ غالب کا تیسرا ایڈیشن چھاپا تو اس میں یہ قطعہ بھی شامل کر لیا اور جب کلامِ غالب کی شرح تیار کی تو مہر کی کتاب ''غالب'' کے حوالے سے اس کی شرح بھی لکھی۔نظامی مرحوم نے جب تفضّل حسین کوکب کی کتاب فغان دہلی کو از سرِ نو مرتب کیا اور اس کا نام فریادِ دہلی رکھا تو منقولہ بالا قطعہ مع ترجمہ غالب کا اس میں اضافہ کیا،کوکبؔ کی تالیف اس اندراج سے خالی تھی۔لیکن کسی مضبوط حوالہ اور ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی میں اس قطعہ کو غالب سے منسوب کرنا سراسر زیادتی ہے۔

اُٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ، میں، جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے یک طائرِ مجروحِ پر بستہ
پٹکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ ''او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستم گر آفتِ جاں سے؟''
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا: میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا ، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر، ہوگیایوں خاک، میری آہِ سوزاں سے

یہ غزل مسلسل جسے بغیر مطلع کی ہونے کی وجہ سے قطعہ کہا گیا ہے سات شعروں پر مشتمل ہے غالب کی وفات ۱۸۶۹ء کے ۳۸ برسوں کے بعد عبدالحمید شیدا کے درج ذیل خط کے حوالے سے مخزن کے شمارہ اپریل ۱۹۰۷ء میں پہلی بار چھپا تھا۔ خط کا متن یہ ہے۔ ''تھوڑے دن ہوئے میجر سید حسن صاحب بلگرامی سے تذکرۂ شعرا ہو رہا تھا، جس میں انھوں نے غالب کا ایک قطعہ سنایا۔ قطعے کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اُن کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ ان کے والدِ مرحوم سے ان کو پہنچا اور اب تک غالب کے کسی کلام میں شائع نہیں ہوا، اس کی خوبی زیادہ کردی۔ میں نے اُن سے لکھ لیا اور اُن کی اجازت سے مخزن کو بھیجتا ہوں۔ شیدا از کیمبرج''۔

دیوان غالب شائع کردہ نظامی پریس بدایوں کے ایڈیشن میں یہ قطعہ مخزن ہی سے ماخوذ ہے۔ مولانا نظامی نے اپنی شرح غالب میں ''نقادانِ سخن'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اس قطعہ کو غالب کے انداز بیان سے مختلف سمجھتے ہیں اور بعض اہل الرائے دیوانِ غالب طبع سوم پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس قطعہ کو دیوانِ غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ باوجود اس کے کسی مضبوط معاصر شہادت کے بغیر محض سنی سنائی بات پر یقین کر کے اسے دیوانِ غاب اور شرحِ دیوانِ غالب میں شامل کیا اور یہیں سے یہ قطعہ متعدد عام ایدیشنوں کے علاوہ امتیاز علی خاں عرشی کے مُرتبہ دیوانِ غالب اور کالیداس گپتا رضا کے دیوان غالب کامل میں شامل ہوا۔ یہ کسی طور تحقیق کا معتبر اور مستحسن طریقہ کار نہیں ہوسکتا۔

سطور بالا میں زیرِ بحث اشعار اُس پورے کلام کا اِحاطہ نہیں کرتے جو دانستہ یا بر بنائے سہو غالب سے منسوب کردیے گئے ہیں۔ بلکہ ان کی تعداد اور زیادہ ہے۔ ایسے اشعار کلامِ غالب کے عام تجارتی ایڈیشنوں ہی میں نہیں ہیں بلکہ دو معتبر تحقیقی ایڈیشن ''دیوان غالب مُرتبہ عرشی اور دیوان غالب کامل مُرتبہ کالیداس گپتا رضا میں بھی درآئے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ غالب جیسے بڑے شاعر کا دیوان از سرِ نو مُرتب کرا کر غالب انسٹی ٹیوٹ نیو دہلی سے شائع کیا جائے۔ تلافی مافات کی یہی ایک واحد صورت ہوسکتی ہے۔

شہاب الدین ثاقب

غالب شناسی کی روایت اور علی گڑھ

اردو میں غالب شناسی کی روایت کا باضابطہ طور سے آغاز سرسید اور ان کے بعض رفقا کے ذریعہ ہی ہوا تھا۔ یہاں سرسید کے بڑے بھائی سید محمد کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ ان سے غالب کے دوستانہ مراسم تھے۔ غالب نے سید محمد کو ''یکے از دوستان روحانی من'' قرار دیا ہے اور غالب کا دیوان اردو سب سے پہلے سید محمد نے اپنے مطبع سید المطابع (مطبع سید الاخبار) سے اکتوبر ۱۸۴۱ء (شعبان ۱۲۵۷ھ) میں شائع کیا تھا اور اس کے اگلے ہی ماہ ۲۴ر نومبر ۱۸۴۱ء (۹ر شوال المکرم ۱۲۵۷ھ) کو غالب کی فارسی تصنیف ''پنج آہنگ'' کا ایک جامع تعارف اور اشتہار بھی اپنے اخبار میں چھاپا تھا۔[۱] جس سے پتہ چلتا ہے کہ سید محمد ''پنج آہنگ'' کی اشاعت کا بھی ارادہ رکھتے تھے۔[۲]

۱۸۴۷ء میں سرسید کی کتاب ''آثار الصنادید'' شائع ہوئی تو اس کا چوتھا باب مشاہیر دہلی کے ترجمۂ احوال پر مبنی تھا۔ اس میں مشائخ دہلی کے حالات کے بعد سرسید نے سترہ شعرائے دہلی کے حالات بیان کیے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے غالب ہی کا ترجمہ شامل ہے اور ان کے حالات، شاعرانہ کمالات، نثر کے اقتباسات اور انتخاب کلام کے لیے سرسید نے تقریباً سترہ

صفحات وقف کیے۔ یہ غالب سے متعلق پہلی مفصل تحریر تھی۔ مفصل اس لیے کہ آثار الصنادید سے قبل شعرائے اردو کے چند تذکروں میں غالب کا اجمالاً ذکر آیا تھا۔ ایسے تذکروں میں:

عیار الشعرا (خوب چند ذکا۔ سال آغاز: ۱۷۹۸ء/ ۱۲۱۳ھ۔ سال اتمام: ۱۸۳۲ء/ ۱۲۴۸ھ)

عمدۂ منتخبہ (اعظم الدولہ سرور۔ سال آغاز: ۱۸۰۱ء/ ۱۲۱۶ھ۔ سال اتمام: ۱۸۱۲ء/ ۱۲۲۶ھ)

گلشن بے خار (مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ سال آغاز: ۱۸۳۲ء/ ۱۲۴۸ھ۔ سال اتمام: ۱۸۳۵ء/ ۱۲۵۰ھ)

گلدستۂ نازنیناں (کریم الدین۔ ۱۸۴۴ء)

گلستان بے خزاں (قطب الدین باطن۔ ۱۸۴۵ء) اور بہار بے خزاں (احمد حسین سحر۔ ۱۸۴۵ء) کے نام تو گنائے جا سکتے ہیں لیکن ان میں سے صرف دو تذکرے یعنی ''گلشن بے خار'' (مطبوعہ: ۱۸۳۷ء) اور ''گلدستۂ نازنیناں'' (مطبوعہ: ۱۸۴۵ء) ''آثار الصنادید'' سے قبل شائع ہو پائے تھے اور ان کا حال بھی ۲۹ کے چاند کی مانند تھا کہ جسے بہت سے لوگوں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر ورخشاں کی تقریظ بھی مختصر ہی تھی۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید شائع ہوئی تو اس سال دلی کے کلکٹر اسٹین رابرٹس اس کا ایک نسخہ اپنے ساتھ انگلستان لے گئے اور ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' لندن میں پیش کیا تو ''ممبران سوسائٹی نے اس کو بہت پسند کیا اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کے بعض ممبروں نے مسٹر رابرٹس سے کہا کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔''[۳] اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ آثار الصنادید کی اشاعت سے غالب کی شہرت دیارِ فرنگ تک جا پہنچی۔ غالب نے ارسطو جاہ مولوی رجب علی کو بھی آثار الصنادید کا ایک نسخہ خرید کر بھیجا اور ان کے نام خط لکھ کر بڑی خوبصورتی سے آثار الصنادید کے چوتھے باب کے مطالعہ کے لیے ان کو ترغیب دلائی چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''......دریں زمانہ یکے از دوستاں کتابے مع نقشہ ہائے آثارِ عمارات دہلی کہنہ و نو نگاشتہ، گوئی چمنے آراستہ است و مع ہذا باب چہارم کہ ختم کتاب برآں است، رقم ہائے اشعار سخن سنجان ایں دیار ہم دارد۔ چوں بندہ را ایں نسخہ از روے جامعیت پسند آمد، یک نسخہ را از نسخۂ منطبع کہ مشتمل بر سہ جلد است از مطبع خریدہ بہ

ارمغان می فرستم وچشم قبول ایں نذر حقیر دارم واطلاع رسیدن
ایں رامع الجواب نامۂ پیش امیدوارم۔''
(اسداللہ، یک شنبہ ۲۶/ذی الحجہ ۱۲۶۳ھ، مطابق ۵/دسمبر
۱۸۷۴ء)

سرسید نے غالب کی قدرت کلام کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں موسّس اساس شیوا بیانی، بانی پائے الفاظ ومعانی، عندلیبِ بہارستانِ سخن گستری، طوطیِ شکرستان معنی پروری اور خسروِ معانی قرار دیا ہے۔ سرسید نے کلام غالب میں فکر کی بلندی، معنی کی رنگینی، ملاحت اور شیرینی جیسی خصوصیات کو نشان زد کیا ہے اور غالب کو حافظ، انوری، عنصری، خاقانی اور امیر خسرو جیسے شعرا کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

سرسید کے رفقا میں مولانا الطاف حسین حالی کا نام غالب شناسی کے سلسلے میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور ان کی لازوال تصنیف ''یادگار غالب'' ہے جو ۱۸۹۶ء میں مکمل ہوئی اور نامی پریس کانپور سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ غالب کی سوانح اور فکروفن سے متعلق یہ پہلی مفصل اور مربوط تصنیف ہے۔ غالب نے ۱۸۴۸ء سے اردو میں خطوط تو آسان زبان میں لکھنے شروع کیے اور مراسلے کو مکالمہ بنادیا لیکن شاعری میں ان کی مشکل پسند طبیعت نے ان کی شہرت ومقبولیت کو نقصان پہنچایا اور غالب کو جیتے جی وہ قدرومنزلت نصیب نہ ہوسکی جس کے وہ حقیقی طور پر مستحق تھے اور ان کے انتقال کے بعد اندیشہ تھا کہ جو کچھ ان کی یادگار باقی رہ گئی ہے وہ زمانے کی گرد میں کہیں دھندلی نہ ہوجائے۔ اس سلسلے میں جو کسر رہ گئی تھی وہ محمد حسین آزد نے پوری کردی اور اپنی مشہور کتاب ''آب حیات'' (۱۸۸۰ء) میں شاعرانہ فضیلت کا تاج غالب کے بجائے اپنے استاد ذوق دہلوی کے سر پر رکھ دیا اور یہ فیصلہ سنایا کہ:

''ذوق پر ہی نظم اردو کا خاتمہ ہوگیا چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ
ایسا قادرالکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔''

غالب کے سلسلے میں مولانا آزاد نے یہ تاویل پیش کی کہ:

''مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی نظم ونثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا
فخر سمجھتے تھے۔''[۴]

اس لحاظ سے گویا محمد حسین آزاد کے نزدیک کلام ذوق کی بہ نسبت غالب کی اردو شاعری

پراتنی توجہ صرف کرنا ضروری نہ تھا۔ مولانا حالی بھی غالب کے شاگرد تھے اور محمد حسین آزاد کا غالب کی شاعری کے ساتھ ایسا سلوک حالی کو ناگوار محسوس ہوا۔ غالباً اسی لیے بعض حلقوں میں ''یادگار غالب'' کو ''آبِ حیات'' کا ردِ عمل قرار دیا جاتا ہے۔

''یادگارِ غالب'' کو حالی نے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کے سوانحی حالات اور اخلاق و عادات کا بیان ہے اور دوسرا حصہ مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ سوانحی حالات کے ضمن میں غالب کی کچھ خاص خاص نظمیں یا اشعار جن کا تعلق کسی واقعے سے ہے، اور ان کے بعض لطائف و نوادر جن سے غالب کی طبیعت کا اصلی جوہر اور ان کی قوت متخیلہ کا واضح طور پر اظہار ہوتا ہے، انھیں بھی حالی نے حسب موقع شامل کر دیا ہے۔ ان باتوں کی وضاحت انھوں نے دیباچہ میں بھی کر دی ہے۔

سوانحی حالات کے سلسلے میں حالی نے غالب کے متعدد بیانات کو واقعیت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کر لیا ہے اسی لیے حقائق کی غلطیاں ان کے یہاں راہ پا گئی ہیں، مثلاً:

(۱) غالب کے بقول ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں واردِ ہندوستان ہوئے تھے، حالی نے اسے ویسے ہی نقل کر دیا ہے جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا کے دادا قوقان بیگ، شاہ عالم کے زمانے میں نہیں بلکہ محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے۔ حالی نے غالب کے دادا کا نام بھی ظاہر نہیں کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں نام کا پتا نہیں رہا ہوگا۔

(۲) غالب نے خود کو پہلے ترک ایبک افراسیابی النسل کہا اور اس کے بعد خود کو سلجوقی بتایا۔ حالی نے بھی غالب کو ترک ایبک قرار دیا ہے لیکن یوسف حسین خاں کے بقول ایبک کسی ترکی قبیلے کا نام نہیں ہے۔ غالباً اس سے ان کی مراد ازبک ہے جو بدخشاں میں آباد تھی۔

(۳) مرزا غالب نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ ''باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ بہادر کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا......'' حالی نے بھی عبداللہ بیگ خاں کے بارے میں یہی بات نقل کر دی لیکن یوسف حسین خاں کا خیال ہے کہ غالب نے اپنے چچا نصراللہ بیگ خاں اور اپنے والد کی جمعیت کو گڈمڈ کر دیا

ہے۔نظام علی خاں کے منصب داروں کی فہرست میں غالب کے والد کا کہیں بھی نام نہیں ہے اس لیے واضح ہے کہ وہ حیدرآباد میں بہت معمولی حیثیت کے کارگزار رہے ہوں گے۔''[۵]

اسی طرح حالی پر اعتراض ہے کہ انھوں نے غالب کی زندگی کی بہت سی تفصیلات بیان کرنے سے گریز کیا ہے جو انھیں اس زمانے میں بآسانی معلوم ہوسکتی تھیں۔اس کے علاوہ حقائق کی غلطیاں بھی جا بہ جا ''یادگار غالب'' میں موجود ہیں۔غالب کی تعلیم کے سلسلے میں حالی نے عبدالصمد کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا اور دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔ قاضی عبدالودود نے عبارتِ غالب متعلق بہ عبدالصمد نقل کی ہے کہ:

''درسال یک ہزار و دویست و بست وشش ہجری بہ طریق سیاحت بہ ہند آمدہ و بہ اکبرآباد پیکر پذیرفتن و خرد آموختن ہم درآن شہر فجستگی بہراست، دوسال بہ کلبۂ احزانِ من آسودہ است۔''

اس سے تو ظاہر ہے کہ عبدالصمد دو سال تک آگرے میں ہی غالب کے ساتھ رہا۔اسی لیے قاضی صاحب معترض ہیں کہ:

''عبدالصمد کا دہلی جانا حالی کہاں سے لائے؟ اور ان کے پاس غالب کے علاوہ کوئی اور ذریعۂ اطلاع تھا تو اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟''[۶]

عبدالصمد کے سلسلے میں حالی نے غالب کا یہ قول پیش کیا ہے کہ:

''مجھ کو مبدءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد ایک فرضی نام ہے، چونکہ لوگ مجھ کو بے استادا کہتے تھے،ان کا منھ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔''

اور پھر حالی اس بات پر مصر ہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم وبیش فارسی زبان سیکھی تھی لیکن غالب کے بیانات کی تاویل پیش کرتے ہوئے حالی خود متضاد بیانی کا شکار ہو گئے مثلاً ان کا یہ اقتباس دیکھیے:

''......مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمدان کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اس نے وہاں قیام کیا۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اس کی تعلیم کا عدم و وجود برابر ہو جاتا ہے۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبدءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔''

لیکن حالی اپنے اس قول کو بھول جاتے ہیں اور ایک دوسری جگہ پھر یہ فرماتے ہیں کہ:

''مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور ان کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔''

قاضی عبدالودود صاحب نے بہ دلائل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملا عبدالصمد فرضی نام ہے جو وجودِ اصلی سے محروم تھا لیکن مالک رام نے قاضی صاحب کی دلیلوں سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ حالی کے بیانات سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ملا عبدالصمد کے استاد غالب ہونے کا مسئلہ واضح طور پر حل نہیں کیا۔ حالی نے غالب کے مسکن سے متعلق لکھا ہے کہ:

''دلی میں ان کے قیام کا زمانہ قریب پچاس برس کے معلوم ہوتا ہے۔ اس تمام مدت میں انھوں نے غالباً یہاں کوئی مکان اپنے لیے نہیں خریدا۔ ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں رہا کیے......۔''

لیکن حالی کا یہ قول خود غالب کے بیانات سے متغائر معلوم ہوتا ہے۔ انوارالدولہ شفق کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

''مرا از پیادگانِ داک تا پوست ماستر ہمہ می دانند سی سال است کہ خانہ و کاشانہ فروختہ کو بہ کو می گردم و مقامی معین ندارم......۔'' [کے]

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ غالب کا دلی میں ذاتی مکان بھی تھا جسے انھوں نے فروخت

کردیا تھا۔ کالی داس گپتا رضا کے بقول:

"قیاس غالب ہے کہ یہ آبائی مکان ہوگا جو ان کے دادا قوقان بیگ خان نے اپنے قیام دہلی کے دوران خریدا ہوگا...... جسے غالب نے ۱۸۲۳ء میں فروخت کر دیا۔"[۸]

کلکتے کا سفر بھی غالب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے لیکن حالی نے سفر کلکتہ اور مجادلۂ اہل کلکتہ کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ اس سفر کی روداد میں بھی تاریخی حقائق کی بعض غلطیاں حالی کے یہاں راہ پا گئی ہیں، مثلاً:

(۱) حالی کا بیان ہے کہ "مرزا کی عمر کچھ چالیس برس کی تھی کہ وہ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچتے تھے۔" لیکن اس وقت غالب کی اصل عمر صرف ۳۲ سال کی تھی۔

(۲) حالی کے بقول غالب جب لکھنؤ پہنچے ہیں، اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں روا اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے، لیکن یہ بھی غلط ہے۔ اصلاً وہ زمانہ غازی الدین حیدر اور معتمد الدولہ آغا میر کا تھا۔

(۳) حالی کے بقول غالب نے لکھنؤ میں ایک مدحیہ نثر صنعت تعطیل میں روشن الدولہ کے لیے لکھی تھی لیکن یہ نثر بھی دراصل روشن الدولہ کے لیے نہیں بلکہ معتمد الدولہ آغا میر کی شان میں لکھی گئی تھی اس سلسلے میں غالب نے خود ہی یہ لکھا ہے کہ:

"...... رفتہ رفتہ ذکر خاکساری ہائے مرا بہ بزم آغا میر نامی از سادات عامہ آن دیار کہ دران روز ہا بہ آہنگ معتمدولگی بلند آوازہ بود بہ ترخانی فرماں روای آن جانب ایمای کششی رفت...... جنون شوقم بہ پیدای کنار تا پیدای نثر انداخت وسواد عبارتی ہم در صنعت تعطیل روشن ساخت......"[۹]

(۴) حالی کا بیان ہے کہ غالب پورے دو برس کلکتے میں رہے۔ لیکن اصلاً غالب کا صرف ۱۹ مہینے تک کلکتے میں قیام رہا۔

غالب کی گرفتاری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ:

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے، برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اسی

چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا......"

اس جرم کی سنگینی کو ہلکا دکھانے کی غرض سے حالی نے غالب کے ایک فارسی خط کے اقتباس کا اردو ترجمہ بھی پیش کردیا ہے جس میں غالب نے صفائی دی ہے کہ "کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف" اسی لیے گرفتاری کا یہ واقعہ پیش آیا۔(۱۸۴۷ء، ۲۵ رمئی) لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے پہلے اگست ۱۸۴۱ء میں بھی غالب اپنے گھر میں جواخانہ چلانے کے جرم میں گرفتار ہوئے تھے اور جرمانہ ادا کرنے پر رہائی ملی تھی۔ حالی نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا کہ اس سے غالب کی شخصیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے قاضی عبدالودود نے "یادگار غالب" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "......حالی، غالب کے نہایت عقیدت مند شاگرد تھے اور مرنجان مرنج شخص، غالب کے سسرالی اعزہ اوران کے دوسرے تلامذہ کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے، صرف یہی نہیں کہ انھوں نے کچھ باتیں جو ان کے علم میں تھیں، بہ مصلحت درج "یادگار" نہیں کیں، انھوں نے محاسن کو بڑھا کر اور معائب کو یکسر قلم انداز کرنا ممکن نہ ہوا تو گھٹا کر دکھایا......"[۱۰]

"مہر نیم روز" کی تسوید سے متعلق حالی نے لکھا ہے کہ "مہر نیم روز ختم ہونے کے بعد مرزا نے ذرا دم لینے کے لیے چند روز توقف کیا تھا اور ارادہ تھا کہ جلد دوسرا حصہ (ماہ نیم ماہ) شروع کردیں گے کہ اتنے میں غدر ہوگیا۔"

حالی کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے چند روز پہلے مکمل کی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ "مہر نیم روز" اگست ۱۸۵۴ء میں مکمل ہو چکی تھی۔

"خدمت اصلاح اشعار پادشاہ" کے عنوان سے بہادر شاہ کی غزلوں پر غالب کی اصلاح کا ایک واقعہ جو حالی نے بیان کیا ہے، قاضی صاحب نے بجا طور پر اس کے ماننے میں تامل کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "بادشاہ کا کلام دیوان عام میں اس طرح دیکھا جائے کہ حاضرین پر یہ ظاہر ہو جائے کہ بادشاہ کی ۸، ۹ غزلوں میں سے کسی میں ایک دو مصرعے سے زیادہ نہ تھا۔"[۱۱]

غالب کی بدیہہ گوئی کے سلسلے میں حالی نے جو واقعہ لکھا ہے اس میں مذکور ہے کہ فیضی

جب پہلی ہی بار اکبر کے روبہ رو گیا تھا، اس نے ڈھائی سو شعر کا قصیدہ اسی وقت ارتجالاً کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے کہ ''اب بھی اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں کہ دو چار سو نہیں تو دو چار شعر ہر موقع پر بداہۃً کہہ سکتے ہیں۔ مخاطب نے جیب سے ایک چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا جو ان کے دیوان ریختہ میں موجود ہے۔''

اس سلسلے میں قاضی صاحب معترض ہیں کہ ''مقتضائے مقام تھا کہ اس قطعے کی شان نزول جو خود غالب نے لکھی ہے اس کا ذکر ہوتا...... طرہ یہ کہ ۲۵۰ راشعار کے قصیدے کے مقابلے میں ۱۳ رابیات کا قطعہ کہنے میں کچھ بڑائی نہیں نکلتی۔''[۱۲] حالی نے اس سلسلے میں دیوان غالب دیکھا بھی نہیں کیوں کہ چکنی ڈلی والے قطعے کو انھوں نے گیارہ اشعار کا بتایا ہے جب کہ دیوان میں یہ تیرہ اشعار پر مشتمل ہے۔

حالی نے لکھا ہے کہ غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے بلکہ گھر سے بھی باہر نہیں نکلے۔ جوں ہی بغاوت کا فتنہ اٹھا، انھوں نے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور گوشۂ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کیے۔'' لیکن حالی کا یہ بیان بھی واقعیت کے خلاف ہے۔ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ ''یہ صرف شورش کے آخری ایام کے متعلق صحیح ہو سکتا ہے۔''[۱۳] غالب نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے جو حالات اور واقعات ''دستنبو'' میں بیان کیے ہیں وہ گھر میں بیٹھ کر ان کو ہرگز معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ حالی نے ''دستنبو'' کے مندرجات اور غدر کے سلسلے میں غالب کے نقطۂ نظر سے متعلق تبصرے سے یکسر گریز کیا ہے۔ اسی طرح آدھا مسلمان ہونے والی حکایت کا تعلق بھی کرنل برون (Col. Burn) سے نہیں بلکہ سارجنٹ سے ہے اور اس واقعے کی تفصیل ''انتخاب غالب'' میں موجود ہے۔[۱۴]

''قاطع برہان'' سے متعلق حالی نے لکھا ہے کہ ''یہ ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہو گئی پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں بہ اضافۂ دیگر مضامین و فواید اس کو دوسری بار چھپوایا اور اس کا نام ''درفش کاویانی'' رکھا۔''[۱۵] لیکن یہ دونوں تاریخیں حالی نے غلط لکھی ہیں۔ ''قاطع برہان'' پہلی بار مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی جس میں تاریخ اشاعت ۲۰ ر رمضان ۱۲۷۸ھ درج ہے جو مطابق ہے ۲۲ ر مارچ ۱۸۶۲ء کے۔ ''درفش کاویانی'' کا سال اشاعت بھی ۱۲۷۷ھ نہیں بلکہ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) ہے۔ حالی نے ''قاطع برہان'' کی مخالفت کے جو اسباب بیان کیے ہیں وہ بھی قابل

قبول نہیں معلوم ہوتے۔ انھوں نے ''برہان قاطع'' پر غالب کے زیادہ تر اعتراضات کو صحیح قرار دیا ہے تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ غالب کو فارسی لغت ومحاورے پر دسترس حاصل تھی لیکن قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور نذیر احمد نے غالب کے متعدد اعتراضات کی تغلیط کی ہے۔

حالی نے مرزا حیدر شکوہ کو اکبر شاہ کا بھتیجا اور مرزا سلیمان شکوہ کا بیٹا بتایا ہے۔ (یادگار، ص:۹۵) لیکن اصلاً مرزا حیدر شکوہ مرزا کام بخش کے بیٹے اور مرزا سلیمان شکوہ کے پوتے تھے۔

غالب کی سیرت و شخصیت کے بیان میں بھی حالی بیشتر مواقع پر جذبات عقیدت سے مغلوب نظر آتے ہیں۔ غالب کی شراب نوشی کا معاملہ بھی انھوں نے بہت ہلکے پھلکے انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں حالی کے بیانات کے برخلاف نواب سید امین الدین خاں فرماں روائے لوہارو سے روایت ہے کہ بوتلیں غالب کے پاس دھری رہتی تھیں۔ شراب کی بوتلوں کے علاوہ نمکین بادام بھی ایک دو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے جنھیں گزک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔''[۱۶]

حالی نے غالب کی فراخ حوصلگی اور وسیع المشربی کی بھی تعریف کی ہے اور ''وسعت اخلاق'' کے عنوان کے تحت یہ بھی لکھا ہے کہ غالب نے ایک میسوری شہزادے کو کتاب بھیجی تھی، اس نے قیمت دریافت کی، غالب نے جواب دیا کہ میں سوداگر نہیں کہ قیمت لوں، کتاب نذر ہے، شہزادے جو کچھ عطا کریں وہ تبرک ہے۔ قاضی صاحب معترض ہیں کہ ظاہر ہے، قیمت تین روپے ہوتی اور تبرک کا ٹھکانا نہیں، غالب نے قیمت سے کہیں زیادہ رقم وصول کرنے کی کوشش کی تھی، حالی اسے ان کی خوبی سمجھتے ہیں۔''[۱۷]

امراؤ بیگم سے غالب کے تعلقات کچھ واجبی قسم کے ہی تھے لیکن حالی کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت اچھے تعلقات تھے۔

غالب کی تاریخ وفات کا ذکر کرتے ہوئے حالی نے لکھا ہے کہ'' آخر ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرہویں کو تہتر (۷۳) برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔'' لیکن وفات کے وقت غالب کی اصل عمر ۷۳ برس اور چار مہینے نہیں بلکہ بہتر (۷۲) سال، ۳ مہینے اور ۲۲ دن کی تھی۔ اس قسم کے بہت سے اعتراضات ''یادگار غالب'' کے سلسلے میں کیے گئے ہیں اور اس تعلق سے مولانا غلام رسول مہر، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، وحید قریشی اور خلیل الرحمٰن داؤدی وغیرہ نے جی بھر کے داد تحقیق دی ہے۔ ان اعتراضات کے صحیح ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے سوانحی حالات پر اس قدر گہرائی

اور باریک بینی کے ساتھ تحقیق بھی ''یادگار غالب'' کی بدولت ہی ممکن ہوسکی۔

یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''یادگار غالب'' پر جتنے بھی اعتراضات ہوئے ان میں سے بیش تر کا تعلق غالب کے سوانحی حصے سے ہی ہے جب کہ خود حالی کا مقصد غالب کی سوانح لکھنا نہیں تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی دونوں سوانحی تصانیف ''حیات سعدی'' اور ''حیات جاوید'' کے ناموں میں لفظ ''حیات'' کا سابقہ برقرار رکھا لیکن غالب کی سوانح ''حیات غالب'' کے بجائے ''یادگار غالب'' کے نام سے لکھی۔ اس سے ان کے مطمحِ نظر اور اس تصنیف کے دائرۂ کار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مزید وضاحت ''یادگار'' کے دیباچہ میں کی ہے، لکھتے ہیں:

> ''.......... مرزا کی لائف میں کوئی منوہ بالشان واقعہ ان کی شاعری وانشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا لہٰذا جس قدر واقعات ان کی لائف سے متعلق اس کتاب میں مذکور ہیں ان کو ضمنی اور استطرادی سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب وغریب ملکہ کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خداتعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرایے میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور رند مشربی کے لباس میں اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔ پس جو ذکر ان چاروں باتوں سے علاقہ نہیں رکھتا اس کو اس کتاب کے موضوع سے خارج سمجھنا چاہیے۔''[۱۸]

اب سوال یہ ہے کہ غالب کی سوانح لکھنا جب حالی کا مقصد ہی نہیں تھا تو انھوں نے اس کتاب کے پہلے حصے میں سوانحی حالات کا باب ہی کیوں قائم کیا؟ جواباً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے حالی کا مدعا غالب کی خاندانی برتری، وجاہت، علمی استعداد اور سیرت وشخصیت کا نقش قارئین کے دلوں پر بٹھانا تھا تاکہ اس نابغۂ روزگار ہستی سے لوگ اچھی طرح متعارف اور مانوس ہوجائیں۔ غالب کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف قرار دینے اور جابہ جا ان کے لطیفوں اور چٹکلوں کو پیش کرنے کے پیچھے بھی حالی کا مقصد یہی تھا کہ غالب کی شخصیت سے عوام کو دلچسپی محسوس ہونے

لگے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالی اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔

جب یہ واضح ہوگیا کہ ''یادگارِ غالب'' کی تصنیف کا اصل مقصد مرزا کو بہ حیثیت شاعر اور نثر نگار پبلک سے روشناس کرانا اور ان کا ادبی مرتبہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنا تھا، تو پھر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حالی نے یہ فریضہ کس حد تک انجام دیا۔اپنے اصل مقصد کی تکمیل کے لیے حالی نے ''یادگار'' کے دوسرے حصے کو چار ذیلی فصلوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) نظم اردو (۲) نثر اردو (۳) نظم فارسی اور (۴) نثر فارسی۔

اور اسی ترتیب سے ہر قسم کا تھوڑا تھوڑا انتخاب بھی جدا جدا فصلوں میں درج کیا ہے۔

سب سے پہلے حالی نے غالب کی اردو شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے اور ان کے اشعار کا عمدہ انتخاب پیش کرتے ہوئے مشکل اشعار کی تشریح اور فن شعر کی باریکیوں پر توجہ صرف کی ہے۔کلام غالب کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے حالی نے ان کی جدت پسندی، تخیل کی بلند پروازی، معنی آفرینی، استعارہ، کنایہ اور تمثیل کے فنی استعمال، شوخی و ظرافت، مخصوص طرزِ ادا، تہ داری اور تصوف و تفلسف کی نشان دہی کی ہے۔یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ کلام غالب کی تعیین قدر کے لیے حالی نے جو پیمانے ''یادگار'' کے ذریعہ مرتب کر دیے تھے وہ طویل عرصے تک سکہ رائج الوقت کی طرح جاری رہے۔گوپی چند نارنگ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ:

> ''یادگار میں غالب پر تنقید قائم کرتے ہوئے حالی نے بجا طور پر سب سے زیادہ زور طرفگی خیالات اور جدت و ندرت مضامین پر دیا ہے جسے ایک زمانے نے تسلیم کیا ہے اور جسے بعد کی غالب تنقید برابر دہراتی آئی ہے۔''۱۹

اردو نثر کے تعلق سے حالی نے غالب کے مکاتیب، تقریظوں اور دیباچوں کا ذکر کیا ہے۔غالب کی اردو مکتوب نگاری کے سلسلے میں البتہ حالی کا بیان واقعیت پر مبنی نہیں ہے۔غالب ۱۸۵۰ء سے ''مہر نیم روز'' لکھنے میں مصروف ہوگئے تھے اس لیے حالی کا قیاس ہے کہ غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے غالب نے اردو زبان میں خطوط لکھنے شروع کیے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کی اردو مکتوب نگاری کا سلسلہ مارچ ۱۸۴۸ء سے شروع ہوگیا تھا۔بعض دانش وروں کو حالی سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے غالب کی اردو نثر سے متعلق زیادہ کچھ نہیں لکھا۔حالی نے اس باب کے شروع میں ہی یہ اشارہ کر دیا تھا کہ: ''مرزا کی اردو نثر کے قدردان بہ نسبت ناقدردانوں

کے، ملک میں بہت زیادہ نکلیں گے۔'' (یادگار، ص:۱۸۰) اور یہ بھی بتایا ہے کہ بعض اوفیشیل (Official) تحریروں میں ''اردوئے معلیٰ'' اور ''بوستان خیال'' کی عبارت کو ایک مرتبے پر رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالی پر یہ اعتراض بے معنی محسوس ہوتا ہے۔ تاہم انھوں نے غالب کی مکتوب نگاری کی بنیادی خصوصیات کی نشان دہی کرتے ہوئے جا بہ جا خطوط سے اقتباسات بھی درج کیے ہیں اور یہ حصہ اٹھارہ صفحات کو محیط ہے۔

غالب کے فارسی کلام کے انتخاب اور تشریح و تعبیر کے سلسلے میں حالی نے وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو اردو کلام پر ریویو کرتے ہوئے اپنایا تھا۔ نظیری اور ظہوری کے متعدد اشعار سے غالب کے کلام کا انھوں نے موازنہ بھی کیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تقابلی تنقید کی خشت اول فارسی شاعری کے حوالے سے حالی نے رکھی تھی۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مناجات، قطعات وغیرہ جملہ اصناف سخن سے متعلق غالب کے فارسی کلام کا عمدہ انتخاب اور تبصرہ اس حصے میں شامل ہے۔

فارسی نثر میں غالب کے امتیازات اور خدمات بھی حالی نے تفصیل کے ساتھ واضح کی ہیں اور مختلف النوع تحریروں کے اقتباسات بھی پیش کرتے ہوئے ظہوری، شیخ حزیں اور ابوالفضل کی نثر سے غالب کی نثر کا موازنہ کیا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب معترض ہیں کہ حالی نے سوالات عبدالکریم، قادر نامہ، باغ دودر اور رسالہ متعلق بانک کا مطلقاً ذکر نہیں کیا، اسی طرح مثنوی ''ابر گہربار'' کو حالی نے غالب کی آخری تصنیف قرار دیا ہے۔ جب کہ یہ نہ آخری تصنیف ہے نہ بالکل آخری زمانے میں لکھی گئی۔ غالب کی زندگی میں ان کی اردو/ فارسی تصانیف جس ترتیب سے شائع ہوئیں ان کے ذکر سے بھی ''یادگار'' خالی ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور ضمنی اعتراضات کے باوجود قاضی صاحب بھی معترف ہیں کہ:

> ''یادگار غالب پہلی کتاب ہے جو غالب کے حالات اور فن پر لکھی گئی۔ یہ غالب سے متعلق بعض صحیح معلومات کا ماخذ ہے اور اس کی بدولت غالب کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔.....'' ۲۰

واقعی ''یادگار غالب'' پہلی کتاب ہے جس نے غالب فہمی اور غالب شناسی کی راہ ہموار کی۔ غالب کا کوئی بھی محقق اور نقاد اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ حالی نے اس تصنیف کے ذریعہ بیک وقت کئی فریضے انجام دیے۔ غالب کے سوانحی حالات سے متعلق بنیادی معلومات سے

لے کر غالب کی شخصیت کو مقبول بنانے کے ساتھ ساتھ غالب کے سرمایۂ نظم و نثر کے بہترین انتخاب، دقیق اور مشکل اشعار کی تشریح اور فنی باریکیوں کی وضاحت تک ہر لحاظ سے یہ حالی کی ایسی تصنیف ہے جس کی معنویت اور افادیت کبھی کم نہ ہوگی۔ یہ غالب کی دلچسپ سوانح عمری بھی ہے اور غالب تنقید/ غالب تحقیق کے سلسلے کی بنیادی کتاب بھی۔

سرسید کے رفقا میں علامہ شبلی نعمانی نے غالب پر کوئی کتاب تو نہ لکھی لیکن غالب کی مکتوب نگاری اور شاعری پر ان کا مختصر ریمارک بھی یہاں قابل ذکر محسوس ہوتا ہے۔ غالب کی خطوط نگاری کے امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے اور چونکہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے، اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، مسرت و خوشی، حسرت و بے کسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا......''[۲۱]

اسی طرح ''موازنۂ انیس و دبیر'' کی تمہید میں شبلی نے فلسفہ اور شاعری کو برابر درجے کی چیزیں گردانتے ہوئے غالب کے فلسفہ کو شاعری کی جان قرار دیا ہے۔ اس جملے میں کلام غالب سے متعلق نہایت بلیغ اشارہ موجود ہے۔ غالب کی فارسی قصیدہ نگاری پر شبلی نے ''شعر العجم'' کی پانچویں جلد میں تفصیل سے بحث کی ہے اور غالب کے اجتہاد فکر اور جدت ادا کی تعریف کی ہے۔

سرسید، حالی اور شبلی کے بعد طلبائے علی گڑھ میں سے حسرت موہانی، سہا مجددی اور

عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب شناسی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ حسرت موہانی ایم اے او کالج علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلّٰی کے بانی تھے۔ غالب کے مجموعۂ مکاتیب کے نام کی مناسبت سے انھوں نے اپنے رسالے کا نام بھی ''اردوئے معلّٰی'' رکھا تھا۔ حسرت نے دیوان غالب اردو مع شرح مرتب کر کے ۱۹۰۵ء میں دہلی سے شائع کیا۔ کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے غالب کے سوانحی حالات بیان کیے اور کلام غالب کی اہم خصوصیات اور فنی باریکیوں کی نشان دہی کی۔ یہ شرح انھوں نے مبتدیوں کے لیے لکھی تھی اس لیے اختصار کو ملحوظ رکھا لیکن اس کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۰۶ء میں حسرت موہانی نے اختصار کے عیوب کو کافی حد تک دور کرنے کی کوشش کی اور بعض اشعار کے مطالب از سرِ نو تحریر کیے۔ ۱۹۲۲ء تک اس کے پانچ ایڈیشن منظرعام پر آچکے تھے، اسی سے اس شرح کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حسرت موہانی نے اس شرح میں غالب کے کچھ ایسے اشعار بھی پہلی بار شامل کیے تھے جو متداول دیوان غالب میں نہیں تھے، اسی طرح اس میں ۲۵ رایسے اشعار بھی شامل تھے جو گل رعنا میں پائے گئے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں یہ شرح کراچی سے بھی شائع ہوئی لیکن اس کے بارے میں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ حسرت نے غالب کے بہت سے اشعار کو آسان گردانتے ہوئے ان کی تشریح سے گریز کیا اور جا بجا اشعار کے مطالب بیان کرنے میں اختصار سے کام لیا ہے۔ پھر بھی ہمیں یہ اعتراف تو کرنا ہی پڑے گا کہ حسرت موہانی کی اس کوشش کی بدولت کلام غالب کی تفہیم وتشریح کا سلسلہ تیز تر ہوتا گیا۔ سہا مجددی اور قاضی سعید الدین احمد کی شرحیں اسی تسلسل کا حصہ ہیں۔ ممتاز احمد سہا مجددی علیگ نے مطالب الغالب کے نام سے دیوان غالب کی مکمل شرح لکھی جو ۱۹۲۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۱ء میں لاہور سے اس کے مزید ایڈیشن جاری ہوئے۔ قاضی سعید الدین احمد کی شرح ''مطالب غالب عرف ہدیۂ سعید'' مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جولائی ۱۹۲۶ء میں منظرعام پر آئی۔ ان شرحوں کی بدولت تفہیم غالب کی راہیں مزید ہموار ہوئیں۔ غالبیات کے سلسلے میں حسرت موہانی کے ''انتخاب سخن'' اور ''ارباب سخن'' کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ''انتخاب سخن'' جلد دہم میں کلام غالب کا ایک جامع انتخاب پیش کیا گیا ہے اور غالب کے ۸ تلامذہ کے کلام کا انتخاب بھی اس میں شامل ہے۔ اسی طرح ''ارباب سخن'' میں غالب کے متعدد شاگردوں اور ان کے کلام سے ہم متعارف ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ حسرت موہانی نے غالب اور متعلقات غالب دونوں کے مطالعے کا سلسلہ قائم کیا۔

حالی کی ''یادگارِ غالب'' کے بعد ''غالب تنقید'' کے باب میں علی گڑھ کے سابق طالب علم عبدالرحمٰن بجنوری کی کتاب ''محاسن کلام غالب'' دوسرا اہم اضافہ قرار دی گئی۔ اور اس کتاب کی تسوید بھی ایم اے او کالج علی گڑھ کے ساختہ و پرداختہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریک پر ہوئی تھی۔ مولوی صاحب کی سکریٹری شپ کے زمانے میں ہی انجمن ترقی اردو نے ۱۹۱۴ء میں دیوان غالب کا ایک صحیح اور عمدہ ایڈیشن چھاپنے کا ارادہ کیا تو اس وقت یہ بھی خیال تھا کہ اردو کے نامور اہل قلم سے غالب کی شاعری پر مضامین لکھوا کر ان کے کلام کے ساتھ شائع کیے جائیں۔ انجمن نے دیوان غالب کا ایک صحیح قلمی نسخہ بھی فراہم کر لیا تھا۔ یہ نسخہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر کا لکھوایا ہوا تھا اور غالب کی نظر سے بھی گزرا تھا۔[۲۲] انجمن کی سالانہ رپورٹ بابت ۱۹۱۶ء (ص:۱۱) سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت یہ ایڈیشن مکمل و مرتب ہو چکا تھا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (مشیر تعلیم ریاست بھوپال) اس کے لیے مقدمہ لکھ رہے تھے اور کوشش یہ تھی کہ آئندہ سال (۱۹۱۷ء) اس کی اشاعت ہو جائے لیکن پھر یہ پروگرام ملتوی کر دیا گیا جس کے اسباب پر مولوی عبدالحق کے درج ذیل بیان سے روشنی پڑتی ہے:

> ''........ انجمن ترقی اردو کو تلاش سے بعض (غالب کی) غیر مطبوعہ غزلیں اور خارج شدہ اشعار ضرور مل گئے تھے لیکن اس بات کی کسی کو امید نہ تھی کہ مرزا صاحب کا پورا خارج شدہ کلام کبھی میسر آ جائے گا۔ یہ محض حسن اتفاق اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی سعی کا نتیجہ ہے کہ بھوپال کے ایک کتب خانے سے یہ گنج گم شدہ برآمد ہو گیا (سب سے پہلے کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں اس نسخہ پر مولوی عبدالسلام صاحب کی نظر پڑی تھی) انجمن کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب مرحوم اس کی تصحیح و ترتیب وطبع کا انتظام فرما رہے تھے کہ ان کی بے وقت اور پر الم موت نے اس کے ساتھ بہت سی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔''[۲۳]

دیوان غالب کی اشاعت اس زمانے میں تو انجمن ترقی اردو کے ذریعہ عمل میں نہ آ سکی لیکن مذکورہ بالا تفصیل سے یہ انکشاف ضرور ہوتا ہے کہ انجمن، دیوان غالب کے صحیح ایڈیشن اور

بالخصوص نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت کے لیے کوشاں تھی۔ مفتی محمد انوار الحق (ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال) نے ''دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ'' مرتب کر کے مفید عام اسٹیم پریس آگرہ سے ۱۹۲۱ء میں طبع کرایا تو عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا وہ مقالہ بھی بطور مقدمہ اس میں شامل کر لیا اور ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''...... جب انجمن ترقی اردو نے دیوان غالب اردو کی ایک نئی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظر انتخاب مرحوم پر پڑی اور انھوں نے بھی اس ملکی اور ادبی خدمت کو بطیبِ خاطر قبول کیا...... مرحوم نے بڑے اہتمام سے اس کے سرانجام کا قصد کیا۔ سب سے پہلے دیوان غالب کے مختلف اور متداول نسخے بہم پہنچا کر نہایت احتیاط سے اس کی تصحیح کی اور اس کے ساتھ ہی غالب کی شاعری پر ایک ضخیم اور بسیط تبصرہ لکھنا شروع کیا...... [۲۴]

بجنوری کا یہ مقالہ ''محاسن کلام غالب'' سب سے پہلے انجمن کے رسالہ ''اردو'' بابت ماہ جنوری ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اور اسی سال کتابی صورت میں بھی انجمن نے اسے شائع کر دیا۔ بجنوری کا تعلق اردو کے تاثراتی دبستان تنقید سے ہے۔ لہٰذا یہ مقالہ بھی اسی اندازِ نقد کا حامل ہے اور اس کا پہلا ہی جملہ کہ:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوان غالب۔ بجنوری کے اسی اندازِ تنقید کا غماز ہے۔ انھوں نے اس میں تجزیاتی طریق کار بھی اختیار کیا ہے لیکن اس میں تاثراتی اندازِ فکر ہی غالب ہے۔ یہ مقالہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں پہلی بار غالب کی عظمت کو مغربی مفکرین اور شعرا کے حوالے سے دریافت کر کے غالب کو ایک آفاقی شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ برکلے، شیکسپیئر، گوئٹے، ورجل وغیرہ سے بجنوری نے غالب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ صرف غالب کی عظمت کے احترام اور استحکام کا ہی معاملہ نہیں ہے بلکہ اپنے مشرقی سرمایے کی قدر و قیمت پر غور کرنے اور احساس کمتری سے ہمیں باہر نکالنے کی بھی ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس لحاظ سے بجنوری اس مقالے میں ''غالب تنقید'' سے کچھ اور بھی آگے نکل گئے ہیں اور ہمیں قومیت اور وطن دوستی کے جذبے سے سرشار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس مقالے سے بجنوری کی عالمی ادب سے واقفیت اور گہری دلچسپی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے غالب کے

سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس سے صد فی صد اتفاق ضروری نہیں ہے مثلاً وہ غالب کے عشق میں تقدیس کا پہلو تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''......مرزا غالب کی معشوقہ ایک ارضی عورت ہے۔ ان کا عشق ہوس سفلیہ اور لذات حرصیہ سے پاک ہے ان کو اس کے حسن بے پایاں کے دیکھنے سے ایک ارتعاشِ روحانی، ایک وجد الٰہی پیدا ہوتا ہے جس میں جذبات کامرانی اور خواہشات کا مجوئی کا کوئی عنصر نہیں......'' ۲۵

لیکن چند ہی صفحات کے بعد غالب کی وہ غزل بھی پیش کی ہے، جس کا ایک شعر ہے:

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

مگر چند اختلافات کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب کو پہلی بار بجنوری جیسا تنقید نگار ملا جس نے تنقیدی بصیرت اور عالمی پیمانوں کے ذریعے غالب کے کلام کا جائزہ پیش کیا۔ اس کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں صرف کلام غالب کے محاسن پر ہی توجہ صرف کی گئی ہے، معائب پر نہیں۔ اس سلسلے میں غور طلب بات ایک یہ بھی ہے کہ بجنوری نے غالب کی اردو شاعری کا جائزہ نسخۂ حمیدیہ کے تمام اشعار کی روشنی میں نہیں بلکہ متداول دیوان کو سامنے رکھ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، یوسف حسین خاں، گیان چند جین، اختر اورینوی، مجنوں گورکھپوری اور شیخ محمد اکرام وغیرہ نے بجنوری کے خیالات سے جابہ جا اختلاف ظاہر کیا ہے لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ اتنے سارے غالب شناسوں نے بجنوری کی تردید میں اپنے اپنے دلائل پیش کیے اور ان نقادوں کی تحریروں سے بھی ''غالب تنقید'' کی روایت پروان چڑھتی گئی۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو سے متعدد بار شائع ہوئی۔ ۱۹۲۵ء، ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۸ء، اور ۱۹۶۶ء کی اشاعتیں اس کتاب کی مقبولیت پر دال ہیں۔ پاکستان میں بھی اس کے متعدد ایڈیشن جاری ہوئے۔ غلام حسین ذوالفقار نے اسے مرتب کر کے خیابان ادب لاہور سے ۱۹۶۹ء میں شائع کرایا۔ اسی سال زاہد علی نے بھی اسے مرتب کیا اور دارالکتاب کراچی سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ غالب کی شہرت ان کی شاعرانہ قدرت کی بنا پر ہے

لیکن بجنوری کے اس مقالے نے بھی غالب کے حق میں کافی حد تک راہ ہموار کی ہے۔

دانش گاہ علی گڑھ میں اردو کے جن اساتذہ نے غالب کو اپنی توجہ اور دلچسپی کا موضوع بنایا ان میں رشید احمد صدیقی، احسن مارہروی، ظہیر الدین علوی، آل احمد سرور، خورشید الاسلام وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر انشائیہ نگار تھے اسی لیے ان کی تنقیدی تحریروں میں بھی کچھ یہی انداز جھلکتا ہے۔ غالب کے سلسلے میں بھی ان کے بعض اقوال دور دور تک مشہور ہوئے اور ان سے اختلاف بھی کیا گیا۔ مثلاً غالب کی شاعری سے متعلق رشید صاحب کا پہلا تبصرہ ان کی کتاب ''زبان اردو پر سرسری نظر'' (مطبوعہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء) میں نظر آتا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک جگہ یہ لکھا تھا کہ:

''غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے و ہو اور ناؤ نوش کی ترجمان ہے۔'' رشید صاحب کی اس رائے کو مولوی عبدالحق نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

غالب پر رشید صاحب کا پہلا مضمون ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا'' علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا عنوان غالب ہی کے ایک مصرعے پر مبنی ہے۔ اس میں رشید صاحب نے لکھا ہے:

> ''مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین باتیں کہوں گا: غالب، اردو اور تاج محل۔'' ۲۶

مذکورہ بالا قول کی بلاغت اور حسن خیال سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اس پر بھی یہ اعتراض کیا گیا کہ رشید صاحب، اردو زبان و ادب کی قدامت اور اس کے تاریخی ارتقا سے ناآشنا ہیں اور اردو کا سلسلۂ آغاز مغلوں سے جوڑتے ہیں لیکن اس سے آگے بھی رشید صاحب نے ان تینوں (یعنی غالب، اردو اور تاج محل) کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور سوائے ہندوستان کے کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی محاسن جھلکتے ہیں۔'' ۲۷

رشید صاحب کے ان خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مغلیہ تہذیب، جو ہندوستان کے

Composite Culture کا بہترین نمونہ تھی، اس کے مبلغ اور شیدائی ہیں۔ ان کی اس فکر کے واضح نقوش ان کی کتاب ''غالب کی شخصیت اور شاعری'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ دراصل رشید صاحب کے دو خطبات ہیں جو انھوں نے نظام اردو خطبات سیریز کے تحت شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں فروری ۱۹۶۹ء میں پیش کیے تھے اور جو کتابی صورت میں دہلی یونیورسٹی سے پہلی بار ۱۹۷۰ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئے۔ خطبۂ اول میں غالب کی شخصیت کا مطالعہ اس عہد کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ اس میں ایک اور خاص بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت کو ان کی شاعری کے حوالے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کی طرف رشید صاحب نے کتاب کے ابتدائی صفحات میں ہی اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ''غالب پر سوچیے تو ان کا کلام اور ان کے کلام پر غور کیجیے تو غالب بن بلائے سامنے آ جاتے ہیں۔''۲۸

اس طرح وہ خطوط غالب میں بھی تصنیف اور مصنف کے درمیان ہم آہنگی کو غالب کی شخصیت کا امتیاز بتاتے ہیں۔

خطبۂ دوم میں ''غالب کی شاعری'' کو رشید صاحب نے تفصیل کے ساتھ موضوع بحث بنایا ہے۔ شیکسپیئر اور گوئٹے کی طرح غالب کو بھی وہ عظیم فن کاروں کی صف میں جگہ دیتے ہیں کیوں کہ ''ان کے کلام کے آئینے میں ہماری تہذیب کی پوری جلوہ گری ملتی ہے۔'' (ص:۵۷) اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''غالب نہ صرف ایک عظیم تہذیب اور روایات کے امین ہیں بلکہ عظیم تر تہذیب و روایت کے خالق بھی ہیں.......... غالب اور ان کے عہد کو نظر میں رکھیں تو آج ہم ان سے ڈیڑھ سو سال کے فاصلے پر ہیں لیکن ان کی شخصیت اور شاعری کی کرامت کو دیکھیے کہ پہلے سے زیادہ آج ہم ان کو حاضر الوقت پاتے ہیں......'' (ص:۶۰)

رشید صاحب کے اس مقالہ سے غالب کی شاعری اور ان کے فکری و فنی ارتقا کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے رشید صاحب کا یہ مقالہ اردوئے معلّیٰ دہلی (غالب نمبر حصہ دوم، فروری ۱۹۶۹ء) اور رسالہ ''نقوش'' (غالب نمبر۳، شمارہ نمبر ۱۶، ۱۹۷۱ء) کے علاوہ اور بھی کئی رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ اس مقالے کو مہر الٰہی ندیم اور لطیف الزماں خاں نے ''غالب نکتہ داں''

کے نام سے جنوری ۱۹۹۷ء میں مکتبہ دانیال کراچی سے شائع کرایا۔ اس میں رشید صاحب کے غالب سے متعلق ۵ دیگر مضامین کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔

مولانا احسن مارہروی (استاد شعبۂ اردو علی گڑھ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۸ء) نے خطوط غالبؔ کے دو انتخابات مرتب کر کے شائع کیے تھے۔ پہلا ''منتخبات عود ہندی'' کے نام سے ۱۹۲۹ء میں اور دوسرا انتخاب ''مکاتیب الغالب'' کے نام سے بک کمپنی علی گڑھ سے (ب ت) شائع ہوا۔ یہ غالب کے ۱۸۸ خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں مرتب کے غالب کے سوانحی حالات، سیرت و شخصیت، خصوصیت کلام اور مکتوب نگاری سے متعلق ضروری باتیں بیان کی ہیں۔ غالب کے حوالے سے مولانا احسن مارہروی کی مشہور کتاب ''تاریخ نثر اردو'' یعنی نمونۂ منثورات کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے جو مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے ۱۹۳۰ء (۱۳۴۹ھ) میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا نیا ایڈیشن مرتبہ رحیل صدیقی، قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں غالب کی مکتوب نگاری پر ایک جامع تبصرہ کے ساتھ غالب کے تین (مطبوعہ) خطوط (۲ رخطوط بنام منشی ہرگوپال تفتہ اور ایک خط بنام حاتم علی مہر) کے علاوہ غالب کی دو اردو تقاریظ اور ذکی دہلوی (سید محمد زکریا) کے دیوان پر غالب کی لکھی ہوئی ایک سند کا متن بھی شامل ہے۔ مذکورہ دو تقاریظ میں ایک تو بہادر شاہ ظفر کی مولفہ کتاب سے متعلق ہے۔ یہ تقریظ غالب نے ۱۸۵۴ء میں لکھی تھی۔ اس تقریظ کا ذکر یہاں اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''غالب اور شاہانِ تیموریہ'' (مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی، دسمبر ۱۹۷۴ء) میں اس کا کچھ تذکرہ نہیں کیا ہے اور ''یادگار غالب'' میں بھی ان تقریظوں کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔

سید ظہیر الدین علوی (استاد شعبۂ اردو، ۱۹۳۸ء تا ۱۹۵۸ء) نے ''اشک و رشک غالب'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ ہمیں کلام غالب کے دو اہم مضامین ''اشک'' اور ''رشک'' پر مبنی اشعار اور ان کے مختلف رنگوں سے آشنا کراتی ہے۔

اسی طرح پروفیسر مسعود حسین خاں کے مرتب کردہ ''انتخاب کلام غالب'' کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے جو ۱۹۹۱ء میں سرسید بکڈپو علی گڑھ شائع ہوا تھا۔ اس میں پیش لفظ کے علاوہ غالب کے کلام کا انتخاب، ردیف وار تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ قصائد، قطعات اور رباعیات کی

ترتیب بھی تاریخی اعتبار سے رکھی گئی ہے۔اس انتخاب کے علاوہ مسعود حسین خاں نے غالب سے متعلق درج ذیل ۵ مضامین بھی تحریر کیے:

(۱) کلام غالب کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو۔آج کل، ماہنامہ، نئی دہلی، فروری ۱۹۶۹ء

(۲) غالب کے نانا، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء

(۳) کلام غالب کے قوافی و ردیف کا صوتی آہنگ، مشمولہ عرفان غالب، مرتبہ آل احمد سرور، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

(۴) غالب کے نکتہ چیں، نظم طباطبائی، غالب نامہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۱ء

(۵) غالب کی حیاتِ معاشقہ، اردو ادب، دہلی، شمارہ ۴، ۱۹۹۶ء

''غالب تنقید'' کے سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور کا نام بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔غالب پر سرور صاحب کے تحریر کردہ مضامین کے ساتھ ساتھ غالبیات سے متعلق کتابوں پر ان کے تبصروں کو بھی اگر نگاہ میں رکھیں تو ان کی مجموعی تعداد چالیس سے اوپر پہنچ جائے گی۔ غالب پر ان کا پہلا مضمون سہ ماہی اردو، دہلی، اپریل ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا جو سرور صاحب کے مجموعۂ مضامین ''نئے اور پرانے چراغ'' (مطبوعہ ۱۹۴۶ء) میں بھی شامل ہے۔''غالب کی عظمت'' کے عنوان سے ان کا دوسرا مضمون علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء میں دیکھنے کو ملتا ہے۔سرور صاحب کے دیگر مضامین جن میں غالب کی معنویت اور ان کے فکر وفن کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ان میں:

''غالب کا ذہنی ارتقا'' (مشمولہ ادب اور نظریہ)

''غالب کا نظریۂ شاعری'' (مشمولہ پہچان اور پرکھ)

''غالب کی شاعری کی خصوصیات'' (مشمولہ پہچان اور پرکھ)

''غالب اور جدید ذہن'' (مشمولہ مسرت سے بصیرت تک) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔سرور صاحب نے غالب کی شاعری کے تمام اسرار و رموز کو پوری طرح سمجھنے کے لیے دیوان غالب، نسخۂ حمیدیہ کے مطالعے پر اصرار کیا ہے۔

غالب کی شاعری کے سلسلے میں سرور صاحب کا یہ قول بہت مشہور ہے:

''غالب سے پہلے اردو شاعری دل والوں کی دنیا تھی، غالب نے اسے ایک ذہن دیا۔'' یہاں سرور صاحب نے غالب سے

قبل کی شاعری کی خصوصیات کا خلاصہ اور غالب کے امتیازات
کو دو جملوں میں بیان کردیا۔ اسی طرح سرور صاحب کا یہ قول
کہ ''غالب اپنے دور کے بھی ہیں اور اپنے دور سے آگے
بھی۔'' (مضمون ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب، مشمولہ کچھ
خطبے، کچھ مقالے)

غالب کی آفاقیت اور ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

غالب سے متعلق سرور صاحب کا مطالعہ کسی ایک دائرے میں محدود نہیں رہا۔ انھوں نے غالب کی شخصیت، معنویت، شاعری، نثر اور غالبیات سے متعلق کئی اہم موضوعات پر مضامین اور تبصرے لکھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ''عرفان غالب'' اور ''عکس غالب'' دو کتابیں بھی مرتب کیں۔ ''عرفان غالب'' ان مضامین کا مجموعہ ہے جو غالب صدی کے موقع پر شعبۂ اردو علی گڑھ میں منعقدہ سمینار مارچ ۱۹۶۹ء میں پیش کیے گئے تھے اور ۱۹۷۱ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ عرفان غالب دراصل غالب کے ۱۵۶ خطوط کا انتخاب ہے۔ یہ وہ خطوط ہیں جو ادبی محاسن اور موضوعات کے اعتبار سے مرتب کی نظر میں زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے درج ذیل تین مضامین ہیں جو مطالعۂ غالب کے سلسلے میں اہمیت رکھتے ہیں:

(۱) غالب اور عصر جدید۔ مشمولہ، فکروفن، خلیل الرحمٰن اعظمی، آزاد کتاب گھر، دہلی ۱۹۵۶ء/ نقد غالب مرتبہ مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۵۶ء

(۲) کچھ خطوط غالب کے بارے میں، مشمولہ عرفان غالب، مرتبہ آل احمد سرور، ۱۹۷۳ء

(۳) یک عمر ناز شوخی عنواں اٹھایئے، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء

موخرالذکر مضمون میں دو سو ایسی کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے جن کے نام غالب کے اشعار سے ماخوذ ہیں (مثلاً نقش فریادی/ بال جبریل/ کاغذی پیرہن/ جوہر آئینہ/ کہتے ہیں جس کو عشق/ ماتم یک شہر آرزو/ ہم کہاں کے دانا ہیں/ یہ خلش کہاں سے ہوتی/ نمرود کی خدائی/ شکست کی آواز/ سنگ گراں اور وغیرہ)

پروفیسر خورشید الاسلام کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے شعبۂ اردو میں سب سے پہلے غالب کو Ph.D کی ڈگری کے لیے اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ انھیں ۱۹۵۴ء میں ڈگری

ملی اوران کا مقالہ ''غالب (ابتدائی دور) کتابی صورت میں انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۹۷۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے جاری ہوا۔ جزوی ترمیم واضافے کے بعد یہ مقالہ ''غالب: تقلید اور اجتہاد'' کے نام سے تیسری بار ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔

غالب نے ۲۵ سال کی عمر تک جو شعری ادب تخلیق کیا تھا اس کا مطالعہ مصنف کی نظر میں اس لیے ضروری تھا کہ اس زمانے کا مطالعہ ہمیں متاخرین شعراے فارسی سے روشناس کراتا ہے جن سے غالب نے اثرات قبول کیے۔ ایسے شعراء میں شوکت بخاری، مرزا جلال اسیر، بیدل، غنی اور ناصر علی کے نام لیے جاتے ہیں۔ اس دور میں غالب نے ناسخ کی پیروی بھی کی ہے۔ غالب کی ابتدائی شاعری پر ان تمام شعرا کے اسالیب کا اثر مصنف نے بڑی دقت نگاہی کے ساتھ تلاش کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سودا، میر اور ناسخ کی غزلوں کی بھی فہرست پیش کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب نے ان ریختہ گو شعراء کی زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے مثلاً دیوان غالب کی پہلی غزل:

(نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا) میر کی زمین (سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا) میں ہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے غالب کی تمثیل نگاری، خیال بندی، مناسبات لفظی سے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے اور اردو غزل کی روایت میں غالب کے امتیازات کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔ یہ مقالہ ''غالب تنقید'' میں ایک اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دانش گاہ علی گڑھ میں غالب شناسی کی روایت کا سلسلہ خورشید الاسلام کے بعد بھی جاری رہا مثلاً:

قاضی عبدالستار نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری میں قنوطیت'' میں غالب کی حزنیہ شاعری کو موضوع بنایا تھا لیکن انھوں نے غالب کو تحقیق وتنقید کی وادیوں سے نکال کر فکشن کا کردار بھی بنا دیا۔ ان کا مشہور ناول ''غالب'' (مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۸۶ء) مغلیہ تہذیب کے کھوئے ہوئے جہان کی سیر کراتا ہوا غالب کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے اور غالب کی ایک مجسم تصویر سامنے آجاتی ہے۔

تفہیم غالب کی روایت میں پروفیسر منظر عباس نقوی کے درج ذیل مضامین کا ذکر بھی ضروری ہے۔

(۱) غالب کے شعری اسلوب کا ایک پہلو، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء

(۲) خطوط غالب کا اسلوبیاتی مطالعہ، علی گڑھ میگزین، ۷۴-۱۹۷۳ء

اول الذکر مضمون ان کی کتاب نثر، نظم اور شعر (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۸ء) میں شامل ہے اور دوسرا مضمون ان کی کتاب اسلوبیاتی مطالعے (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۹ء) میں بھی موجود ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی نے غالب پر انگریزی اور ہندی میں بھی کتاب لکھی لیکن ان کا قابل ذکر کام دیوان غالب کی ترتیب ہے جسے مکتبہ الفاظ علی گڑھ نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ اس کا متن دیوان غالب مرتبہ حامد علی خاں (مجلس یادگار غالب، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء) کی اساس پر مرتب کیا گیا ہے۔ نورالحسن نقوی نے دیوان غالب پر ایک عمدہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ان کا مرتب کردہ یہ دیوان غالب ۱۹۸۳ء، ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء، اور ۱۹۹۶ء میں بھی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے اتنی کثیر تعداد میں شائع ہوتا رہا ہے کہ غالباً اب یہی دیوان غالب کا متداول نسخہ بن گیا ہے۔

نورالحسن نقوی کی دوسری قابل ذکر کتاب ''غالب: شاعر و مکتوب نگار'' ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں غالب کے حالات زندگی، خصوصیات کلام، قصیدہ نگاری اور مکتوب نگاری سے متعلق نہایت مفصل مدلل اور دل نشیں انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں غالب کا منتخب کلام اور انتخاب مکاتیب بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر محمد انصاراللہ کا نہایت عمدہ اور وقیع کام ''غالب ببلیو گرافی'' کے نام سے کتابی صورت میں ۲۸۴ صفحے کی ضخامت پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں سرور صاحب کے پیش لفظ کے ساتھ سامنے آیا۔ مرتب نے اس ببلیو گرافی کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کی اور غالب سے متعلق کتابوں کا مفصل اشاریہ ہے۔ دوسرے حصے میں رسالوں کے غالب نمبر کی فہرست ماہ و سال کی نشان دہی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ رسالوں کے مضامین کی موضوعاتی فہرست اور مضمون نگاروں کے نام پر مبنی ہے۔ دیگر زبانوں میں غالبیات سے متعلق جو کچھ شائع ہوا اس کی تفصیلات ہیں اور آخر میں ضمیمہ کے طور پر یونیورسٹیوں میں غالبیات کے مطالعہ کی تفصیلات اور نو دریافت مخطوطہ دیوان غالب سے متعلق معلومات درج ہیں اور اشاریہ اس پر مستزاد ہے۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مرتب کی نظر ثانی اور نئے اضافوں کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے ۱۹۹۸ء میں جاری ہوا۔ پروفیسر نذیر احمد نے اس کے لیے پیش لفظ لکھا ہے اور مرتب کے کام کی ستائش کی ہے۔

غالبیات کے سلسلے میں ڈاکٹر حامدہ مسعود کی کتاب ''خطوط غالب کا فنی تجزیہ'' (ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۲ء) کے علاوہ ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر کی کتاب ''اردو خطوط نگاری: ایک مطالعہ'' (مطبوعہ ۱۹۹۵ء) کا ذکر بھی یہاں مناسب ہے۔ موخرالذکر کتاب میں غالب کی مکتوب نگاری پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''مرزا غالب کی شخصیت اور شاعری'' پر ایک عمدہ مونوگراف تیار کیا جو اردو اکادمی دہلی سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ غالب سے متعلق قاسمی صاحب کے درج ذیل دو مضامین بھی اہمیت کے حامل ہیں:

(۱) غالب کے خطوط میں اظہار ذات کا مسئلہ، غالب نامہ، نئی دہلی جولائی ۱۹۹۴ء

(۲) غالب کا شعری لہجہ، نقد ونظر، علی گڑھ

قاضی افضال حسین نے بھی غالب پر چند مضامین لکھے ہیں اور پروفیسر انّ میری شمل (Prof.Annemari Schimmel) کی غالب پر انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ ''رقص شرر'' کے نام سے کیا جو غالب اکیڈمی نئی دہلی سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ عقیل احمد صدیقی نے اپنے مضمون ''غالب کے اہم معترضین'' میں یگانہ، عبداللطیف، حسن عسکری اور سلیم احمد کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مضمون عقیل صاحب کی کتاب ''کارگہ کوزہ گراں'' (براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی ۲۰۱۴ء) میں شامل ہے۔

ظفر احمد صدیقی نے غالب سے متعلق چھ مضامین لکھے تھے جو ان کی کتاب ''نقش معنی'' (طبع اول ۱۹۹۹ء، طبع دوم ۲۰۰۱ء، بھارت آفسیٹ، دہلی) میں شامل ہیں لیکن ظفر احمد صدیقی کا غالبیات کے سلسلے میں ایک اور قابل قدر کام سید حیدر علی نظم طباطبائی کی ''شرح دیوان اردوے غالب (مطبوعہ ۱۹۰۰ء) کی ازسرنو ترتیب ہے جسے مرتب نے طویل مقدمہ اور بیش قیمت حواشی سے آراستہ کر کے اس کی افادیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ دہلی سے جنوری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

علی گڑھ میں شعبۂ فارسی، عربی، انگریزی، فلسفہ اور سماجیات کے جن اساتذہ نے غالب

شناسی کی روایت کو زندہ رکھا ان میں ضیاء احمد بدایونی، نذیر احمد، وارث کرمانی، مختار الدین احمد، اسلوب احمد انصاری، وحید اختر اور ابن فرید کے نام قابل ذکر ہیں۔

مولانا ضیاء احمد بدایونی (۱۸۹۴ء-۱۹۷۳ء) کو غالب کے ہم عصر مومن سے دلچسپی تھی لیکن غالب سے متعلق بھی ان کے درج ذیل چار مضامین کا تذکرہ ضروری ہے۔

(۱) غالب کے کلام پر ناقدانہ نظر، علی گڑھ میگزین، ۱۹۳۳ء

(۲) فارسی غزل اور غالب، اردوئے معلّٰی، غالب نمبر حصہ سوم، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

(۳) دیوان غالب بخط غالب، اردوئے معلّٰی، غالب نمبر حصہ سوم، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

(۴) امام بخش صہبائی، معاصر غالب، اردوئے معلّٰی، غالب نمبر حصہ سوم، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۹ء

وارث کرمانی غالب کی فارسی شاعری پر مقالہ لکھ کر علی گڑھ سے ۱۹۶۵ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔ ان کا یہ مقالہ Evaluation of Ghalib's Persian Poetry کے نام سے کتابی صورت میں شعبۂ فارسی علی گڑھ سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ اس سلسلے کی ان کی ایک کتاب اردو میں ''غالب کی فارسی شاعری'' کے عنوان سے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی لیکن غالب کی اردو شاعری سے متعلق انھوں نے درج ذیل مضامین بھی تحریر کیے:

(۱) غالب کی شاعری کا پس منظر، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء

(۲) غالب کی شخصیت اور فن، العلم، کراچی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، / مشمولہ عرفان غالب، مرتبہ آل احمد سرور، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء

(۳) غالب اور جدید ذہن، غالب نامہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۸۴ء

(۴) غالب کی شاعری میں روایت اور اجتہاد، مشمولہ : غزل، فن اور فنکار، مرتبہ ثریا حسین، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۶ء

فارسی کے نامور محقق پروفیسر نذیر احمد نے غالب کی فارسی خدمات سے متعلق بنیادی نوعیت کے تحقیقی کام کیے۔ اس سلسلے کی ان کی اہم کتابوں میں:

''نقد برہان قاطع'' (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۵ء)

غالب پر چند تحقیقی مطالعے (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۶ء)

محاسن الفاظ غالب، کتابیات، لاہور، مئی ۱۹۹۶ء

غالب آشفتہ سر، مرتبہ مہر الٰہی ندیم / لطیف الزماں خاں، ملتان آرٹس فورم ملتان ۱۹۹۶ء

خصوصی طور سے قابل ذکر ہیں۔ان کتابوں میں شامل مضامین سے غالب کی شخصیت کے علاوہ ان کی اردو شاعری اور اردو مکاتیب سے متعلق بعض اہم گوشے روشن ہوگئے ہیں۔

نذیر صاحب ایک عرصے تک ''غالب نامہ'' (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کا رسالہ) کے مدیر اعلیٰ رہے۔ان کی ادارت میں اس رسالے میں غالب اور غالبیات سے متعلق تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے مضامین کثیر تعداد میں شائع ہوئے۔ان مضامین کا ایک عمدہ اور ضخیم (۵۲۲ص) انتخاب نذیر صاحب نے ''تنقیدات'' کے نام سے مرتب کیا جو ۱۹۹۷ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی سے شائع ہوا۔اسی سلسلے کے ایک دوسرے مجموعہ ''غالب کی مکتوب نگاری'' کی اشاعت ۲۰۰۳ء میں ہوئی۔یہ دراصل ''غالب نامہ'' ہی کا ایک خصوصی شمارہ ہے جس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ غالب انٹرنیشنل سیمینار (غالب کے فارسی اور اردو خطوط سے متعلق) ۲۰۰۲ء میں پیش کیے گئے ۱۷ مقالوں کو مرتب کے پیش لفظ کے ساتھ یک جا کر دیا گیا ہے۔

غالب شناسی کے سلسلے میں ایک اہم نام مختار الدین احمد آرزو کا بھی ہے۔علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء کا خصوصی شمارہ غالب نمبر آرزو صاحب کی ادارت اور رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں شائع ہوا تھا جو غالب سے متعلق تحقیق اور غالب تنقید کے سلسلے میں سنگ میل ثابت ہوا۔اس میں خود آرزو صاحب کا تحقیقی مضمون ''نوادر غالب'' شامل ہے۔جس میں غالب کے نایاب خطوط، متعدد غزلیں اور دیگر تخلیقات یکجا ہوگئی ہیں۔علی گڑھ میگزین کے اسی شمارے میں غالب کی کمیاب اردو فارسی تحریروں کا مجموعہ ''آثار غالب'' بھی شامل ہے جسے قاضی عبدالودود نے مرتب کیا تھا۔یہی مجموعہ ''مآثر غالب'' کے نام سے بعد میں شائع ہوا۔ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس پر مفصل حواشی بھی لکھے ہیں۔

آرزو صاحب نے غالب سے متعلق تحقیقی وتنقیدی مضامین کے دو مجموعے ''احوال غالب'' اور ''نقد غالب'' کے نام سے مرتب کیے یہ دونوں مجموعے غالب شناسی کی روایت میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔''احوال غالب'' کا پہلا ایڈیشن انجمن ترقی اردو ہند دہلی سے ۱۹۵۳ء میں اور دوسرا ۱۹۸۶ء میں جاری ہوا۔اس میں آرزو صاحب کے دو اہم مضامین ''سرّ غالب در حدیث دیگراں'' اور ''مرزا غالب کی تصویریں'' شامل ہیں۔اس کا دیباچہ بھی خود ایک مضمون ہی کی صورت میں ہے جس کے ذریعہ اس زمانے تک غالب تحقیق اور تنقید کی صورت حال سامنے آجاتی ہے۔نقد غالب کا پہلا ایڈیشن انجمن ترقی اردو دہلی سے ۱۹۵۶ء میں اور دوسرا الوقار

پبلی کیشنز لاہور سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ غالب اور متعلقات غالب پر آرزو صاحب کے تقریباً چالیس مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون ''مرزا غالب کی تاریخ گوئی'' ادبی دنیا، لاہور مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔۲۹

غالبیات کے سلسلے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا مضمون ''غالب کا فن'' سلسلۂ مطبوعات غالب صدی کے تحت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۷۰ء میں کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔ اس سلسلے کے ان کے مضامین کے دو مجموعے ''نقش غالب'' (غالب اکیڈمی، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۷ء) اور ''نقش ہائے رنگ رنگ'' (غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۹۸ء) غالبیات میں ایک عمدہ اضافہ ہیں۔ ان کی ادارت میں رسالہ نقد و نظر کا غالب نمبر (جلد ۱۹، شمارہ ۲) ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ نقد و نظر کے عام شماروں میں بھی اسلوب صاحب نے غالب کی متعدد غزلوں کے تجزیے شائع کیے۔

وحید اختر علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد تھے۔ ''خواجہ میر درد: تصوف اور شاعری'' ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ لیکن انھوں نے غالب سے متعلق جو مضامین لکھے ان میں چند مضامین حسب ذیل ہیں:

(۱) غالب کا فکری پس منظر، مشمولہ عرفان غالب، مرتبہ آل احمد سرور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۳ء

(۲) غالب اور بیدل، مشمولہ نذر زیدی (کرنل بشیر حسین زیدی) مرتبہ مالک رام، مجلس نذر زیدی، نئی دہلی ۱۹۸۰ء

(۳) خواجہ میر درد اور غالب، اوراق، لاہور، شمارہ ۵، ۶، ۱۹۸۳ء

(۴) ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا نقیب غالب، اسطور یا حقیقت، غالب نامہ، نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۱ء

ڈاکٹر ابن فرید علی گڑھ میں سماجیات کے استاد تھے۔ غالب کے سلسلے میں ان کے درج ذیل مضامین شائع ہوئے۔

(۱) غالب کی شاعری میں شخصیتی کش مکش، علی گڑھ میگزین۔

(۲) غالب کی شاعری میں تسکین ضمیر، مشمولہ: ''میں ہم اور ادب''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۷ء

(۳) غالب کے گرد و پیش شعرائے دلی، مشمولہ: ''میں ہم اور ادب''

(۴) غالب کی شاعرانہ شخصیت، مشمولہ چہرہ پس چہرہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۱ء

(۵) غالب کی شاعری کا تصور ابلاغ، اوراق، لاہور، مئی، جون ۱۹۸۳ء

علی گڑھ میں غالب شناسی کی روایت کا یہ ایک مختصر ساخا کہ ہے تاہم اس کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ سر سید اور ان کے رفقاء کے زمانے سے موجودہ عہد تک دانش گاہ علی گڑھ کے اساتذہ نے غالب کی سوانح، سیرت و شخصیت، عہد اور ماحول، اردو شاعری و مکتوب نگاری اور متعلقات غالب جیسے گوناگوں موضوعات پر تحقیق، تنقید، تدوین اور ترتیب و انتخاب کے لحاظ سے جو کچھ لکھا ہے اسے غالبیات کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس مضمون میں ہم نے سر سید اور ان کے رفقاء سے لے کر حسرت موہانی، عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ کے بعد دانش گاہ علی کے صرف ان ہی اساتذہ کا ذکر کیا ہے جنھوں نے علی گڑھ میں رہ کر کام کیے لیکن وہ اساتذہ جن کا علی گڑھ سے کبھی تعلق رہا تھا اور بعد میں وہ کسی دوسرے ادارے سے منسلک ہو گئے ان کی غالب شناسی پر بھی الگ سے مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسے اساتذہ میں جلیل قدوائی، نوارالحسن ہاشمی، خواجہ منظور حسین، مجنوں گورکھپوری، محمد حسن، شمیم حنفی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کے سابق طلباء میں تنویر احمد علوی، باقر مہدی، بشیر بدر، جاں نثار اختر، ذکاء الدین شایاں، سلطان صدیقی، شان الحق حقی، عابد رضا بیدار، ظہیر احمد صدیقی، افتخار بیگم صدیقی، علی سردار جعفری، فرخ جلالی، محمد مجیب، محمود الٰہی، مغیث الدین فریدی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ممتاز حسین، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ایم حبیب خاں، کاظم علی خاں، اکبر علی خاں عرشی زادہ، احمد جمال پاشا، خلیق انجم، لطیف الزماں خاں وغیرہ کی غالب شناسی پر علاحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ اسی طرح وابستگان علی گڑھ کی فہرست میں یوسف حسین خاں، حنیف نقوی وغیرہ کی غالب شناسی کا جائزہ بھی ایک مفصل مضمون کا متقاضی ہے۔

○

حواشی

(۱) مذکورہ اشتہار کی سرخی اور عبارت حسب ذیل ہے:

اشتہار پنج آہنگ

"اشتہار مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب تخلص، مرزا نوشہ صاحب مشہور کہ آفتاب اور ماہتاب سے زیادہ معروف ہیں، اونکی کتاب "پنج آہنگ" کہ بہت اچھی ہے۔ اگر آدمی اوس کو پڑھ لیوے تو تعریف کے قابل منشی ہو جاوے اور ایسی عبارت لکھنے لگے کہ

اوسکو دیکھ کر لوگ عش عش کریں۔ جناب سید محمد خاں صاحب اوسکو چھپوانا چاہتے ہیں لیکن جب تک دوسو درخواستیں جمع نہ ہولیویں گی تب تک وہ کتاب نہیں چھپ سکتی، اس واسطے کہ وہ کتاب پندرہ سطر کے حساب سے بیس جز کی ہے اوراس کتاب کی قیمت چار روپے ٹھہری۔ شایقین کے واسطے اوسکی آہنگیں بعینہٖ لکھی جاتی ہیں تا کہ بخوبی تمام کتاب کا حال معلوم ہووے۔ آہنگ اول درالقاب وآداب ومراتب ومتعلق آں۔ آہنگ دوم مصادر و مصطلحات ولغات فارسی۔ آہنگ سوم اشعار مکتوبی منتخب از دیوان رشک گلستاں کہ دریں باب بکار آید۔ آہنگ چہارم خطب کتب وتقاریظ وعبارات متفرقہ۔ آہنگ پنجم مکاتبات۔ جس صاحب کواس کو لینے کی خواہش ہواونکو چاہیے کہ درخواست اپنی اس چھاپہ خانہ میں بھیج دیں۔ جب کتاب چھپنی شروع ہوگی تب کتاب......... پہنچانے کے لیے اطلاع دی جاوے گی اور جن لوگوں کی درخواست مع روپیوں کتاب کے چھپنے میں پہنچے گی.......... قیمت کو ملے گی اور کتاب چھپ چکنے کے بعد جو شخص کہ لینا چاہے گا اوسکواس قیمت کو نہیں۔ اس واسطے کہ کتاب کی قیمت بڑھ جاوے گی۔

(اردوئے معلی، غالب نمبر، دہلی، ص: ۶۷۰ و ۶۷۱ کے درمیانی ورق میں اس اشتہار کا عکس شامل ہے)

(۲) جمیل نقوی کے بقول آثار الصنادید کی اشاعت (۱۸۴۷ء) کے زمانے تک پنج آہنگ شائع ہوچکی تھی لیکن مالک رام نے بتایا ہے کہ پنج آہنگ کا پہلا ایڈیشن اگست ۱۸۴۹ء میں مطبع سلطانی لال قلعہ دلی سے شائع ہوا تھا۔ پنج آہنگ کے اشتہار (مشمولہ سیدالاخبار) میں آہنگوں کی جو ترتیب بتائی گئی ہے وہ مطبوعہ کتاب میں پیش کردہ آہنگوں کی ترتیب سے مختلف ہے۔

(۳) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص: ۶۵

(۴) آب حیات، محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبدالسلام، شعبۂ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، مارچ ۲۰۰۶ء، ص: ۳۳۲

(۵) غالب اور آہنگ غالب، یوسف حسین خاں، غالب اکیڈمی، نئی دہلی ۲۰۱۳ء، ص: ۴۷

(۶) کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اول) قاضی عبدالودود، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۹۵ء، ص: ۴۷

(۷) کلیات نثر غالب، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۲۸۷ھ، ص:۳۵
(۸) غالب درون خانہ، مرتبہ کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلشرز، بمبئی، دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ص: ۵۴-۵۳
(۹) کلیات نثر غالب، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۲۸۷ھ، ص:۱۵
(۱۰) کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اول) قاضی عبدالودود، ص:۴۵
(۱۱) محولہ بالا، ص:۵۰
(۱۲) محولہ بالا، ص:۵۰-۵۱
(۱۳) محولہ بالا، ص:۵۱
(۱۴) محولہ بالا، ص:۵۱
(۱۵) یادگار غالب، الطاف حسین حالی، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب لاہور، طباعت دوم، اگست ۲۰۱۲ء، ص:۳۸۲
(۱۶) بحوالہ وحید قریشی، کلاسیکی ادب کا مطالعہ، مکتبہ ادب جدید، لاہور ۱۹۶۵ء، ص:۲۷۲
(۱۷) کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اول)، ص:۴۹
(۱۸) یادگار غالب (دیباچہ)، ص:۳۵
(۱۹) غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات، گوپی چند نارنگ، ساہتیہ اکادمی، دہلی ۲۰۱۳ء، ص:۱۵ (دیباچہ)
(۲۰) کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اول)، ص:۴۴
(۲۱) سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، مقالات شبلی، شبلی نعمانی، ج ا
(۲۲) بحوالہ سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو، ۱۹۱۴ء، ص:۱۴
(۲۳) سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اردو، ۱۹۱۸ء، ص:۲۷
(۲۴) دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ مفتی محمد انوار الحق، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص:۲۸
(۲۵) محاسن کلام غالب، عبدالرحمٰن بجنوری، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص:۹۳
(۲۶) غالب نکتہ داں، رشید احمد صدیقی، مرتبہ مہر الٰہی ندیم/ لطیف الزماں خاں، مکتبہ دانیال، کراچی ۱۹۹۷ء، ص:۱۹

(۲۷) محولہ بالا،ص:۲۰

(۲۸) غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ص:۱۱

(۲۹) تفصیلات کے لیے دیکھیں، مختار نامہ (پروفیسر مختار الدین احمد کے مقالات و تصانیف کا موضوعاتی و وضاحتی اشاریہ، مرتبہ ڈاکٹر عطا خورشید/مہر الٰہی ندیم، علی گڑھ ہیریٹیج پبلی کیشنز، علی گڑھ ۲۰۰۲ء، ص ص:۹۸-۱۰۴

سید حسن عباس

غالبیات میں مولانا عرشی کی چند دریافتیں

مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری کا شمار مشرقی علوم کے نامور اور سربرآوردہ علما و محققین میں ہوتا ہے۔ ان کا دائرۂ مطالعہ و تحقیق بہت وسیع اور متنوع رہا ہے۔ اردو، عربی اور فارسی ادبیات، اسلامیات، مخطوطہ شناسی، کتاب شناسی، فہرست نویسی اور تدوین و تصحیح متون کے میدان میں ان کی خدمات اور سب سے بڑھ کر ماہر غالبیات کی حیثیت سے برصغیر میں وہ اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ رامپور رضا لائبریری جیسے علمی مرکز میں گزارا اور اس کے بیش قیمت علمی ذخائر کو علمی دنیا سے متعارف کرا کے اپنی اور لائبریری کی شان میں زبردست اضافہ کیا۔ ان کی علمی کاوشوں کی بدولت لائبریری کے ساتھ وہ خود بھی عظمت و اعتبار کی بلندیوں سے ہم کنار ہوئے۔ ان کی ان غیر معمولی اور مثالی کوششوں کے سبب انھیں اور رضا لائبریری کو لازم و ملزوم قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ فنافی العلم تھے۔ ایک بڑے عالم اور محقق کی شان بھی یہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ ایک بڑے انسان بھی تھے اور ان کی یہ صفت انھیں مزید ہر دل عزیز بنانے میں بہت معاون اور کارگر ثابت ہوئی۔ اہل علم و فضل کے درمیان انھیں جو عزت و احترام حاصل تھا ویسا ہی احترام عوام الناس میں بھی پایا جاتا تھا۔ وہ ثمر دار درخت کی مانند تھے۔ ان کی شرافت نفس، خاکساری اور منکسر المزاجی سے سبھی واقف ہیں۔ ان کے علمی کارناموں کی

فہرست نہ صرف بہت طویل ہے بلکہ گوناگوں بھی ہے۔ انہوں نے رضا لائبریری کے نادرِ روزگار مخطوطات کو متعارف کرایا اور چھ جلدوں میں عربی مخطوطات کی فہرست سازی کی جبکہ اردو مخطوطات کی ایک جلد تیار کی جس کے لیے انہیں نہ جانے کتنے کیٹلاگ اور فہرست نویسوں کی کاوشوں سے رجوع کرنا پڑا ہوگا۔ جن مخطوطات کی ترتیب و تدوین اور تصحیح کا بیڑا اٹھایا انہیں پوری دیانت داری اور سخت محنت سے معیاری متن تیار کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جس کے سبب وہ علمی دنیا میں ایک بلند پایا محقق و مدوّن کی حیثیت سے اپنا مقام بنا سکے۔ اس خدمت گزاری کے باعث انھیں کئی طرح کے انعامات جیسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کر کے ان کی علمی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ''نذرِ عرشی'' کی پیش کش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

مولانا امتیاز علی عرشی کی تحقیقات و مطالعات کا ایک اہم پہلو غالب شناسی رہا ہے۔ انھیں غالب، اس کی شاعری اور اس کے دیگر آثار سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غالبیات کے موضوع پر بہت گہرا اور دقیق مطالعہ کیا اور اپنی غیر معمولی علمی اور تحقیقی کاوشوں سے غالب کی عظمت کو منوایا۔ مستقل کتابوں کے علاوہ غالب، اس کی تصنیفات و تالیفات اور دیگر متعلقات کے بارے میں بے شمار مضامین و مقالات سپردِ قلم کیے اور ان موضوعات سے دل چسپی رکھنے والوں کو نت نئے پہلوؤں سے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے غالب شناسوں میں ان کا نام اور کام عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اتنے بڑے غالب شناس کی تحریریں رسائل و جرائد کے سینوں میں مدفون تھیں اور جویائے علم و آگہی ان کے متلاشی تو ضرور تھے مگر انہیں وہ دستیاب نہیں ہوتی تھیں یا کچھ ہوتی تھیں اور کچھ ناپید تھیں۔ ثاقب عمران صاحب کی تلاش و جستجو کی داد دینا چاہیے کہ انھوں نے عرشی صاحب جیسے صفِ اول کے غالب شناس کی کم و بیش غالب سے متعلق تمام تحریریں ڈھونڈ نکالیں اور اس طرح ''امتیاز علی عرشی کی غالب شناسی'' کے نام سے ایک بیش قیمت مجموعہ منظر عام پر آسکا۔

مولانا عرشی کی شخصیت اور عظیم خدمات کو فراموش کرنا ناممکن ہے وہ ۱۹۳۲ سے ۱۹۸۱ تک رضا لائبریری سے وابستہ رہے۔ نصف صدی سے زائد کی یہ وابستگی کوئی معمولی چیز نہیں۔ اِن برسوں میں انھوں نے جہاں لائبریری کے ذخائر کو از سر نو مرتب کیا وہیں محدود وسائل میں جو عظیم علمی خدمات انجام دیں خاص کر غالبیات کے حوالے سے، وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ آثار

غالب سے متعلق مولانا عرشی کے علمی کارنامے حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مکاتیب غالب۔ پہلی بار مطبعہ قیمہ بمبئی سے ۱۹۳۷ میں شائع ہوا۔

مکاتیب غالب، مطبعہ قیمہ بمبئی سے ۱۹۳۷ تقریب کے عنوان سے کرنل بشیر حسین زیدی لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ سے ۱۸۶۹ تک مرزا غالب کا نوابین رامپور سے تعلق اور سلسلۂ مراسلت رہا۔ جس کا بڑا حصہ دارالانشار امپور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۵ میں کرنل صاحب نے نواب رضا علی خاں کو اس کی طرف متوجہ کیا اور پھر مولانا عرشی کو اس کام پر مامور کیا گیا۔ دو سال کی مسلسل محنت کے بعد نواب صاحب کی خدمت میں یہ پیش کرنے کی قابل ہوا۔''

مولانا عرشی نے کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ:

''مرزا غالب مرحوم کے سوانح حیات اور کلام نظم ونثر کا انداز ومرتبہ سمجھنے کے لیے خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کی یادگار غالب، مولانا غلام رسول مہر کی غالب، اور مسٹر محمد اکرام کی تازہ ترین کتاب، غالب نامہ عصر حاضر کی وہ مایۂ ناز تصنیفات ہیں جن کے بعد اس مضمون پر کسی مطول یا مختصر تالیف کی ضرورت عرصہ تک محسوس نہیں کی جائے گی اس لیے کہ ان حضرات نے اندرونی وبیرونی شہادتوں پر اپنے بیانات کی بنیاد استوار کی ہے۔''

اس کے باوجود اتنے تفصیلی دیباچے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

''اولاً اس لیے کہ ضروری مواد دستیاب نہ ہونے کے باعث مذکورہ بالا تصنیفات میں میرزا صاحب کے تعلقاتِ رامپور پر، جو ان کی آخری زندگی کا اہم باب ہے، کماحقہ روشنی ڈالنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔

ثانیاً اس لیے کہ ان تالیفات کا دائرہ میرزا صاحب کی ساری کائناتِ ادب کو محیط ہے جس کے سبب سے ان میں خاص انشائے اردو سے سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ ثالثاً اس لیے کہ خود میرزا صاحب غالب نے ۱۴ جنوری ۱۸۵۸ کو نواب فردوس مکاں (ناظم) کی خدمت میں عرض

کیا تھا کہ میری یہ آرزو ہے کہ ولی نعمت کو اپنی ساری روداد سنادوں تا کہ کسی
طرح کا پردہ درمیان نہ رہے۔"

مکاتیب غالب درسی ایڈیشن مطبع سرکاری ریاست رامپور سے ۱۹۴۳ میں شائع ہوا۔

دیباچہ طبع ثانی میں مولانا نے لکھا ہے کہ اصل خطوں سے دوبارہ مقابلہ کر کے متن کو میرزا صاحب کی تحریر کے مطابق بنایا گیا ہے، حواشی کی متعدد غلطیوں کی اصلاح کر کے غیر ضروری عبارتیں حذف کردی گئی ہیں، نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر، خواجہ الطاف حسین حالی، صفیر بلگرامی اور فصیح الدین رنج میرٹھی کے غیر مطبوعہ قصائد اور اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرزا صاحب کے ۱۴ نئے خط بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ان ۱۴ خطوں کی تفصیل یہ ہے۔(۱) نواب فردوس مکاں کو (۲) نواب خلد آشیاں کو۔ (۳) صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بیتاب کو، اور منشی سیل چند میر منشی کو لکھا گیا تھا۔

اس ایڈیشن کے دیباچے میں 'اصلاح غالب' اور 'املائے غالب' کے دو نئے عنوان سے نئے مباحث کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

مکاتیب غالب کے علاوہ، انتخاب غالب جس میں اردو و فارسی کلام شامل ہے ۱۹۴۳ میں قیمہ پریس بمبئی سے شائع کرایا۔ فرہنگ غالب بھی مولانا عرشی کا ایک قابل قدر کام ہے جس میں غالب کے آثار میں شامل الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں، یہ کتاب ۱۹۴۷ میں رامپور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۵ میں بھی منظر عام پر آیا تھا۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس کتاب پر مفصل مضمون لکھا ہے اور اس کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے۔ مولانا عرشی کے غالبیات کے کاموں میں سب سے مشہور کام دیوان غالب نسخۂ عرشی کی طباعت ہے جو ۱۹۵۸ میں منظر عام پر آیا تھا۔ جس سے آپ پوری طرح واقف ہیں۔ اس کتاب پر ۱۹۶۱ میں مولانا کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تھا۔ یہ دیوان تاریخی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کی اساس وہ نسخہ ہے جسے خود غالب نے ۱۸۵۷ میں نواب یوسف علی خاں ناظم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

مولانا عرشی کی دریافتیں

غالب کی چند نئی اردو تحریریں:

لوہارو کلیکشن میں موجود خان آرزو کی کتاب موہبت عظمیٰ، مطبوعہ شرف المطابع ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) کے ص ۱۴، ۱۶، ۴۵، ۵۰، ۵۱، ۵۶، ۵۷، ۶۰، ۶۱، ۶۸ پر غالب کی تحریریں ملتی

ہیں جن کو سیاق و سباق کے ساتھ مولانا نے ایک مضمون میں بہ عنوان 'غالب کی چندنئی اردو تحریریں' شائع کر دیا ہے۔

برہان قاطع اور قاطع برہان کے قضیے سے اہل علم بالخصوص غالب دوست بخوبی واقف ہیں کہ مرزا غالب نے فارسی کی اس مشہور لغت پر کچھ تنقیدیں کی تھیں اور اس کے جواب میں 'قاطع برہان' لکھ ڈالی۔ یہ اور بات ہے کہ جواب الجواب کے طور پر کچھ اور چیزیں سامنے آئیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے پوری کتاب کا تنقیدی جائزہ لے کر 'نقد قاطع برہان' کے نام سے کتاب لکھی جو طبع ہو چکی ہے۔ مولانا عرشی نے رضا لائبریری رامپور میں موجود، برہان قاطع، کے اُس نسخے کے حوالے سے جس پر مرزا غالب کی یادداشتیں تھیں ایک مضمون سپردِ قلم کیا جس کا عنوان تھا 'غالب اور قاطع برہان: چند غیر مطبوعہ تحریریں'۔

قاطع برہان میں جو تحریریں آنے سے رہ گئی تھیں، اُن میں ۵۲ کو اپنے مضمون میں پیش کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ 'انھیں غالبیات میں معقول اضافہ شمار کیا جائے گا'۔

اسی طرح مولانا کا ایک مضمون 'غالب کی چندنئی فارسی تحریریں' ہے۔ اس مضمون میں ردیف جیم سے خے کے الفاظ لیے گئے ہیں جن کی تعداد ۳۷ ہے۔ اور فارسی کی معروف فرہنگوں سے مقابلہ کر کے قول فیصل درج کیا ہے۔

مولانا کا ایک مضمون 'غالب کی نئی فارسی تحریریں' بھی ہے اس کا تعلق بھی برہان قاطع سے ہی ہے۔ یہ مطبوعہ نسخہ ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۹ مطبع افضل المطابع کلکتہ کا ہے۔ یہ ٹائپ میں بڑی تقطیع پر دو کالم میں ۹۲۴ صفحات میں شائع ہوا تھا۔ غالب نے یہ نسخہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی ۱۰/اگست ۱۸۵۸ کو تحفۃً دے دیا تھا۔

یہ نسخہ بڑے اہتمام سے چھاپا گیا تھا یعنی اس کی تصحیح میں اس وقت کے گیارہ علما کی مدد شامل تھی۔ مرزا غالب نے دوران مطالعہ جو اختلافی نوٹ لکھے ہیں وہ کبھی اردو میں اور کہیں فارسی میں ہیں لیکن ہیں قلمِ برداشتہ۔ اس بارے میں مولانا عرشی لکھتے ہیں:

> ''مرزا صاحب اس کتاب کو پڑھتے وقت اپنے اختلافی نوٹ جگہ جگہ حاشیوں پر لکھتے رہے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں اور زیادہ فارسی میں یہ تحریریں سب کی سب قلم برداشتہ اور اس لیے آورد سے پاک ہیں۔ لیکن ان میں سنجیدگی بھی ہے ظرافت بھی ہے غیر ثقاہت بھی، جس سے معلوم ہوتا ہے

کہ وہ جس وقت جس موڈ میں ہوتے تھے ویسی ہی تحریر قلم سے نکلتی تھی۔''

غالب کے برہان قاطع پر اعتراضات کے بارے میں ڈاکٹر محمد معین نے جنھوں نے 'برہان قاطع' کو بڑی محنت اور عالمانہ طریقے سے تصحیح کر کے تہران سے شائع کیا تھا، اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ 'برخی موارد حق با غالب است و در برخی دیگر ایراد نا بجاست و در مواضع بسیار نزاع لفظی است' یعنی بعض معاملات میں غالب حق پر ہیں بعض جگہوں پر اعتراض، نادرست اور بہت ساری جگہوں پر لفظی جنگ ہے۔

مولانا عرشی نے صرف الف سے متعلق وہ تحریریں نقل کی ہیں جو فارسی میں ہیں۔ پہلے برہان قاطع کی عبارت پھر غالب کا اعتراض اور آخر میں جگہ جگہ اپنی رائے بھی لکھی ہیں۔ اس مضمون میں مولانا نے الف کے ۴۹ الفاظ درج کیے ہیں۔

مولانا عرشی نے غالب کی فارسی مثنوی 'ترجمۂ منظوم دعاے صباح' کا متن رضا لائبریری کے مخطوطے کی اساس پر شائع کیا تھا۔ اگرچہ یہ مثنوی اس سے پہلے چھپ چکی تھی۔ اُن کا خیال ہے کہ غالب کی مثنویوں میں یہ کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے اسی لیے غالب نے اس کا تذکرہ کہیں نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی نے بھی یادگار غالب میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ مرزا غالب کے ترجمے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا عرشی نے لکھا ہے کہ:

> اس میں شبہ نہیں کہ مرزا صاحب نے اصل دعا کے مطلب اور مفہوم کو شعر فارسی میں پورا پورا ادا کر دینے میں کمال کر دکھایا ہے حتی کہ بہت سے فقروں کا ترجمہ اتنے ہی مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے جتنے مختصر الفاظ اصل عربی کے تھے اور شاید ہی کسی جگہ اصل عربی کا کوئی لفظ مرزا صاحب کے ترجمے کی گرفت سے بچ نکلا ہو۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالبیات کے حوالے سے رضا لائبریری میں موجود ذخیرے کی فہرست سازی مکمل کر لی گئی ہے اور انشاء اللہ بہت جلد غالب دوستوں کی خدمت میں کتابی صورت میں پیش کی جائے گی۔ اس ذخیرے کا سب سے زیادہ استفادہ خود مولانا عرشی نے کیا ہے اور اپنی محنت شاقہ سے اہل علم بالخصوص غالب دوستوں کی خدمت میں غالب کے آثار پیش کر کے داد و تحسین بھی حاصل کی ہے۔ وہ غالب کو سب سے بڑا اردو شاعر تسلیم کرتے تھے اور بطور مذاق کہتے تھے کہ اردو ادیبوں اور شاعروں کو چاہیے کہ کوشش کر کے اس کو ممنوع الاشاعت قرار دلا دیں اس

لیے کہ اس کی وجہ سے ہماری شعروشاعری کی بہت سی بلند شخصیتیں بھی پست نظر آتی ہیں۔ مولانا عرشی، غالب کے فارسی کلام کو، اس کے اردو کلام پر ترجیح دیتے تھے فرماتے ہیں:

''غالب کے فارسی کلام میں جو پختگی اول تا آخر ہے اور جملہ اصناف سخن میں بلندی پائی جاتی ہے وہ اردو میں نہیں۔''

غالب کی نظم ونثر دونوں اُن کے لیے باعث کشش تھیں لیکن نثر کے مقابلے نظم کو پسند کرتے تھے۔ فارسی نثر کو ناپسند کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ ''اِس میں انھوں نے عربی کے عام الفاظ سے اجتناب کر کے اپنی تحریروں کو نامانوس اور اجنبی بنادیا ہے۔ لیکن مرزا کے خطوط کو پسند کرتے تھے۔ کہتے ہیں: جہاں تک ان کی خطوط نویسی کا تعلق ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی اس درجے کی نثر مشکل سے تخلیق کی جاسکے گی۔

غالب کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

غالب.... دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہیں اور بڑے شاعر کسی ملک یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے غالب کو بھی کسی خاص دَور کا شاعر کہنا غلط ہوگا۔ وہ بھی زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے۔ اگر اس کا صحیح طور پر ترجمہ کیا جاسکے تو خواہ وہ روسی میں ہو یا جرمنی میں یا انگریزی میں، اُس سے ہر زبان وادب کے لوگ لطف اندوز اور فیضیاب ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے:

بیاورید گر اینجا بود سخندانی
غریب شہر سخنہاے گفتنی دارد

اس سلسلے کی آخری بات جو مولانا عرشی فرماتے تھے جس کا ذکر انھوں نے اپنے کسی مضمون میں بھی کیا ہے یہ ہے کہ غالب کو وہ اردو کا واحد ایسا شاعر تسلیم کرتے تھے جن کی زندگی کے لکھے اور چھپے نسخے آج اتنے ملتے ہیں جتنے کسی اور کے نہیں۔ فارسی میں مرزا صائب کو چھوڑ دیا جائے تو فارسی شعرا بھی اس معاملے میں اُن سے آگے نہیں ہیں۔

شہرت شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

○

علیم اشرف خان

عہد حاضر میں غالبیات میں ایک اہم اضافہ: ''تلمیحات غالب''

یوں تو گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں غالبیات میں اہم اضافے ہوئے ہیں۔ جن میں ایوان غالب اور اس کے ارباب حل وعقد کی علمی وادبی خدمات لائق ستائش ہیں جسکا اعتراف بار بار کیا جانا چاہئے۔ اسی طرح غالب اکیڈمی اور دیگر ادارے جیسے رامپور رضا لائبریری، خدا بخش لائبریری وغیرہ بھی نہایت اہم ہیں۔ آج جس کتاب کو موضوع بنایا جارہا ہے وہ پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف جسے ہم غالبیات میں ایک اہم اضافہ کہہ سکتے ہیں وہ کتاب تلمیحات غالب کے عنوان سے معرض وجود میں آئی ہے جسے رامپور رضا لائبریری، رامپور نے ۲۰۱۸ عیسوی میں شائع کیا ہے اور اس کتاب پر نہایت اہم اور محققانہ تحریر پیش نامہ عنوان سے رامپور رضا لائبریری کے علم دوست ڈائرکٹر پروفیسر سید حسن عباس صاحب نے رقم کی ہے جس میں قاسمی صاحب کی فارسی زبان وادب کی مجموعی خدمات کو نہایت صداقت سے انھوں نے بیان کیا ہے۔

اسی کتاب میں ابتدائیہ عنوان سے خود فاضل مؤلف قاسمی صاحب نے ایک وقیع مقدمہ جس میں تلمیحات غالب عنوان سے کئے گئے تحقیقی کاموں، اسکی اہمیت، افادیت اور تالیف کتاب کے اسباب کو سپرد قلم کیا ہے جس میں بجاطور پر انھوں نے علامہ اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے

یہ تحریر کیا ہے:

''فارسی گو شاعر غالب احتمالاً وہ منحصر بہ فرد شاعر ہے جو ہم ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلامی دنیا کے ادب کو تحفہ میں دیا ہے۔ حقیقتاً وہ اُس صف میں شامل ہیں جن کی فکر و دانش، مذہب اور ملّت کی حدود سے بالاتر ہے۔'' 1

یہاں ایک اور بات جو میں ضروری بھی سمجھتا ہوں اور اس کا اظہار یہاں کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں صرف انہی دانشوروں اور ادیبوں کی خدمات سے بحث نہیں کرنا چاہئے جو انتقال کر چکے ہیں البتہ اگر ہم زندہ ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں کا معروضی مطالعہ حقیقت پسندانہ انداز میں انجام دیں جو ابھی بھی اپنے خون پسینے سے لیلائے ادب کی زلفیں سنوارنے میں مشغول ہیں تو یہ کوئی بری بات نہیں سمجھی جانی چاہئے۔ بہر حال اسی تفکر اور اندیشے میں استاد گرامی پروفیسر شریف حسین قاسمی کو بھی شامل کرنا چاہئے اس لیے کہ انکی تحقیقی، علمی و ادبی کاوش جو غالبیات میں ایک اضافہ ہے اسکی پذیرائی بھی علم دوست حضرات پر لازم ہے۔

یوں تو تلمیحات غالب پر اردو میں محمود نیازی صاحب کی کتاب جو ۱۹۷۲ عیسوی میں غالب اکیڈمی سے شائع ہوئی اور ڈاکٹر عائشہ سلطانہ کی ایک کتاب 'کلام غالب میں تلمیحات کا استعمال' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۲۰۱۵ عیسوی میں شائع ہو چکی ہے مگر اس سلسلے میں ماہر غالبیات جناب مولانا امتیاز علی صاحب کی رائے مسلّم ہے:

''غالب دوستوں کے اولین فرائض میں سے ہے کہ اس کی برتی ہوئی تلمیحوں کی محققانہ تشریح و توضیح کی جائے۔'' 2

مذکورہ بالا کتابوں میں بالعموم اردو تلمیحات کو پیش نظر رکھا گیا ہے مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ غالب کا فارسی کلام اردو سے کہیں زیادہ ضخیم ہے جس میں کثرت سے فارسی تلمیحات کا استعمال ہوا ہے، اس لئے قاسمی صاحب کی تلمیحات غالب، فارسی تلمیحات کا بالخصوص اور جا بجا اردو تلمیحات اور انکی توضیح و تشریح پر نہایت تحقیقی انداز میں تحریر ہوئی ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب میں کچھ تلمیحات میں پورے باب اور مقالے موجود ہیں تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ کم از کم ۴ یا ۵ تلمیحات ایسی ہیں جنکی وضاحت بہت تفصیل سے پیش کی گئی ہے مثال کے طور پر خسرو پرویز کے باب میں ۱۳ صفحات، خضر اور آب حیات کے باب میں ۱۱

صفحات،علی بن ابی طالب کے باب میں ۱۲صفحات اور حضرت یوسف کے باب میں بھی ۱۲ صفحات تحریر ہوئے ہیں جنھیں ہم مقالہ اور مفصّل شرح کی فہرست میں شامل کر سکتے ہیں اس میں متداول اور غیر متداول دونوں کلام سے تلمیحات کی مثالیں اُن اشعار کے معنوں کے ساتھ درج ہوئی ہیں جو اور دیگر تلمیحات غالب میں دیکھنے کو نہیں ملتیں یہی اس تحقیق کی امتیازی شان اور خصوصیت بھی ہے جو دیگر کتابوں سے اسے منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔مثال کے طور پر ایک تلمیح ہے 'اشقر'۔غالب کا شعر ہے:

منم کہ فکر من اندر زمین شعر و سخن
ہمی گزشت زاشقر بہ تیز

(ق:۳۹۲،ص ۷۸)

اس تلمیح کی وضاحت میں سرخ بال کا اونٹ یا گھوڑا تحریر ہے۔بعض اہم اشخاص کے گھوڑے کا نام بھی تھا جیسے مروان بن محمد،قتیبہ بن مسلم وغیرہ امیر حمزہ کے قصّے میں اشقر اس کے گھوڑے کا نام بھی ہے۔

غالب نے یہ شعر نواب کلب خان کی مدح میں کہا ہے اور اپنی تعریف کر رہے ہیں کہ شعر وسخن میں میری پرواز فکر تیز رفتاری میں امیر حمزہ کے گھوڑے اشقر کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔

اورنگ زیبی:

غالب کے یہاں نئی تراکیب اور جدّت پسندی کا ایک طومار ہے اس لئے غالب نے ایک شعر میں عالمگیری پھوڑے کو اورنگ زیبی نظم کیا ہے،شعر ہے:

نشان باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر ہاں نام کو اورنگ زیبی

عالمگیری پھوڑے کی توضیح میں قاسمی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ایک قسم کا سوداوی مادہ ہے جو پھوڑے کی شکل میں عام طور پر کلّے پر نکل آتا ہے اور مشکل سے ٹھیک ہوتا ہے۔مشہور ہے کہ جب اورنگ زیب عالمگیر نے دکن کے بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کا محاصرہ گولکنڈے کے قلعے میں کیا تو مغل سپاہی وہاں کی آب وہوا کے عادی نہ تھے محاصرے نے طول پکڑا۔آب وہوا کی خرابی کی وجہ سے سپاہیوں کو پھوڑے پھنسی نکل آئے اور وہاں ایک وبائی صورت کی وجہ سے ان پھوڑوں کو عالمگیر پھوڑا کہا جانے لگا۔اورنگ زیب کا لقب عالمگیر بھی ہے(ص :۸۷)

جیسا کہ خود تلمیح کے لغوی معنی کی بات ہے تو اس میں اشارہ کرنا اور کنکھیوں سے دیکھنا ملتا ہے اور بقول شمس قیس رازی جس نے 'المعجم فی معاییر اشعار العجم' میں وضاحت سے تحریر کیا ہے کہ تلمیح میں وسیع معانی کو کم الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے درست ہے جیسے اورنگ زیبی میں اس پورے واقعے کو بیان کر دیا گیا ہے۔

بونواس:

حسن بن ہانی عربی کا مشہور ایرانی الاصل شاعر ۱۴۶ ہجری/۷۶۳ عیسوی کو اہواز میں پیدا ہوا اور ۱۹۸ ہجری/۸۱۴ عیسوی میں بغداد میں فوت ہوا وہ عربی ادب میں تغزل کا بانی ہے اسکی نشوونما بصرہ میں ہوئی بغداد میں بنی عباس کی مدح سرائی کی۔ دمشق چلا گیا اور پھر مصر منتقل ہوا۔ امیر مصر خصیب کی مدح کی۔ بغداد لوٹ آیا اور فوت ہوا اس کا کلام فصاحت کے لئے معروف ہے

غالب نے کہا:

خوش نوایم مرا رسد کہ ز رشک
زھر در جام بونواس کنم

(ط:۱۰۷،ص۱۰۱)

غالب کہتے ہیں خوش نوا شاعر ہوں، غزل گوئی میں میرا مرتبہ بلند ہے میرے لئے نازیبا نہیں کہ بونواس جیسے غزل گو معروف شاعر پر رشک کروں اور اس کے جام میں زہر بھر دوں یعنی اسکی شہرت کو منسوخ کر دوں۔ یہاں غالب کا تفاخر بھی قابل رشک ہے۔

بہ ہفت آب شستن:

مختلف تہذیبوں، ادیان اور ملتوں میں سات کا عدد اہمیت کا حامل رہا ہے ہندوستانی بھی اس عدد کے تقدّس کے قائل رہے ہیں۔ تورات میں مذکور ہے کہ خدا نے دنیا کو ۶ دنوں میں بنایا اور ساتویں دن کو آرام و استراحت میں گزارا۔ سات آسمان، سات دریا، سات ستارے، وغیرہ اس عدد کی مناسبت اور خصوصیت کے گواہ ہیں اسی طرح کسی چیز کو سات بار دھونے سے اس چیز کی مطلق تطہیر (صفائی اور پاکی) ہو جاتی ہے اسی طرح دوسری نجاست بھی خاص طور سے شراب یا کتے کے باعث ہونے والی غلاظت دور ہو جاتی ہے۔

غالب کا شعر ہے:

افسون گریہ بروز خویت عتاب را
از شعلۂ تو دود بہ ہفت آب شستہ ایم

(غ ۳۰۲،ص:۱۱۱)

جسکی توضیح میں کہا گیا ہے کہ اے محبوب! تو نے ہم پر عتاب نازل کیا اس کی شدّت اور اس سے ہم آنسو بہاتے رہے۔ ہماری حالت زار دیکھ کر تو نے عتاب کرنا چھوڑ دیا۔ گویا ہمارے آنسوؤں کے پانی سے تیرے عتاب کے شعلے کی شدّت اور اس سے پیدا ہونے والی سیاہی ڈھل گئی ہے۔

اسی نہج پر ہم چند اہم تلمیحات کو ذیل میں درج کرتے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً:

پازند ۱۱۷، تتار ۱۲۰، جوزا ۱۲۷، چار عید ۱۳۹، حوت ۱۶۲، خشت برسرخم ۱۸۱، خلخ ۱۹۳، دہلی ۲۱۲، ذوالیمینن ۲۱۸، راجہ اندر کا اکھاڑا ۲۱۹، رای دابشلم ۲۱۹، زمرد وافعی ۲۲۹، سہ گانہ ۲۶۰، شکوہ محرمان عروس ۲۷۲، صاحبقران ثانی ۲۷۹، طوطی آئینہ ۲۹۱، عقیق دردہان نہادن ۲۹۱، فرکیانی ۳۳۸، قراچار ۱۵۳، کدو ۳۶۱، گنج واژدہا ۳۷۹، ماہ مقنع اور ماہ نخشب ۳۹۲، من ربک ۴۰۶ اور نوشادر ۴۴۲ وغیرہ کو انتخاب کر کے اس میں جو اہم واقعات، اشارات اور قصّے و کہانیاں داخل ہیں وہ نہایت دلچسپ اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اگر اس کتاب 'تلمیحات غالب' کا ورق بہ ورق بغور مطالعہ کیا جائے تو بہ آسانی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کتاب نہایت اعلیٰ درجے کی معلومات، تحقیق اور محنت و کاوش کے ساتھ علمی و ادبی میدان میں پتہ ماری کی بہترین مثال ہے میں کتاب کے مؤلف پروفیسر شریف حسین قاسمی صاحب کی خدمت میں اس کتاب کی اشاعت پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں جنھوں نے ۱۵۰ سالوں میں غالب شناسی میں نہایت معتبر اور مستند تحقیقی کام سے علمی وادبی حلقوں کی تشنگی کو سیراب کیا ہے۔

○

حوالہ جات:

1۔ تلمیحات غالب، پروفیسر شریف حسین قاسمی، رامپور رضا لائبریری، رامپور، ۲۰۱۸ عیسوی

2۔ تلمیحات غالب، محمود نیازی، مطبوعہ غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۲ عیسوی

3۔ کلام غالب میں تلمیحات کا استعمال، ڈاکٹر عائشہ سلطانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

شمس بدایونی

غالب صدی کے بعد دیوان غالب کی قابل ذکر اشاعتیں

زندہ و فعال افراد کی طرح کتابیں بھی شہرت، مقبولیت اور عظمت کے معیار و درجات تک پہنچتی رہی ہیں۔ اردو شاعری میں یہ تینوں درجات 'دیوان غالب' کو حاصل ہوئے۔ اپنی اشاعت اول ۱۸۴۱ء سے آج تک صدہا ایڈیشن اس کے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ تحقیق، ترتیب، تدوین اور انتخاب کے مراحل سے بھی یہ لگاتار گزرتا رہا ہے، ہزارہا صفحات پر مشتمل تحقیقی و تنقیدی بحثیں بھی اس پر موجود ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا غالب کی وفات ہوئی۔ فروری ۱۹۶۹ء میں ان کی صد سالہ برسی منائی گئی۔ اس موقعے پر غالب اور غالبیات کے حوالے سے قابل قدر سرمایہ سامنے آیا۔ اس سرمائے کا بڑا حصہ دیوان غالب کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ صدی گزر گئی، ایسی کامیاب صدی جس میں غالب پر تحقیق و تنقید، تشریح و تعبیر کے ایسے اعلا [اصولی و عملی] نمونے پیش کیے گئے جو اردو تحقیق و تنقید کے بھی مثالی نمونے قرار پائے۔ ۱۹۶۹ء سے آج ۲۰۱۹ء تک تقریباً پچاس سال کی مدت میں دیوان غالب پر تحقیقات کا یہ سلسلہ بند نہیں ہوا۔ سطور ذیل میں انہی پچاس سال میں دیوان غالب کے حوالے سے کی جانے والی بعض تحقیقی کوششوں کا تعارف مقصود ہے۔ اس تعارف کو تین شقوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔دیوان غالب کے خطی نسخوں کی بازیافت
۲۔دیوان غالب ومنتخبات کے عکسی ایڈیشن
۳۔غالب کے دیوان اور انتخاب کی تاریخی تدوین

۱۔دیوان غالب کے خطی نسخوں کی بازیافت: ہندوپاک میں غالب کے دیوان کے خطی نسخے بڑی تعداد میں معلوم ودستیاب ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ تدوین کے لحاظ سے کارآمد اور مفید مطلب جن خطی نسخوں کی غالب صدی کے دوران یا اس سے قبل تدوین ہوئی وہ گم ہوگئے۔میری مراد نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ لاہور اور بیاض غالب بخط غالب سے ہے، لیکن گذشتہ پچاس سال کے دوران ان میں سے دو کی بازیافت ہوئی اور یہ اشاعت کے مراحل سے بھی گزرے۔میرے پیش نظر جو نسخے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔دیوان غالب اردو نسخۂ خدابخش، تقدیم: فرخ جلالی۔ناشر: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، اشاعت اول ۱۹۹۶ء، صفحات:[۸+۷۸=]۸۶

خدابخش لائبریری پٹنہ میں رضا لائبریری رامپور کی طرح دیوان غالب کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں، لیکن زیر نظر نسخے کی کتابت [جس کا کال نمبر ۹۲ ہے] بقول قاضی عبدالودود [ف ۱۹۸۴ء] ۱۸۵۷ء سے پیشتر کی ہے۔فرخ جلالی [۲۰۱۳ء] کی رائے میں یہ کتابت ۱۸۴۰ کے آس پاس کی ہے۔یہی سبب بنا اس کو مرتب کرنے کا؛ لیکن افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس کے مقدمے اور حواشی کو آئندہ پر موقوف رکھا گیا۔جبکہ سرورق پر تقدیم کے تحت فرخ جلالی کا نام مرقوم ہے۔اس طور یہ نسخہ چار سطری حرفے چند از عابد رضا بیدار اور دو تعارفی صفحے از قلم فرخ جلالی کے ساتھ شائع کردیا گیا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تعارف بھی مرتب کے کسی مضمون سے اخذ کر کے شامل کرلیا گیا ہے۔اس قیاس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

اول یہ کہ اس نسخے کا تعارف نہیں کرایا گیا، صرف اس طرح کے قلمی نسخوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی۔

دوم اس تعارف کے پہلے صفحے پر، صفحہ نمبر ۱۸۹ درج ہے۔

سوم دوسرے صفحے پر یہ جملہ بھی ہے: میں نسخۂ عظیم آباد کو شائع کرانا چاہتا ہوں۔

اس طور ہم اس نسخے کو مدون کرنے کی وجوہ سے ناواقف رہے۔'حرفے چند' میں عابد رضا بیدار نے لکھا ہے:

دیوان غالب کے کئی قلمی نسخے خدابخش لائبریری میں محفوظ ہیں۔فرخ جلالی صاحب نے ان میں سے ایک کا خصوصی مطالعہ کر کے اس کی تدوین کی ہے اور اس پر تفصیلی حواشی لکھے ہیں۔اس نسخے کا تعارف اور متن پیش کیا جارہا ہے،مقدمہ اور حواشی اگلی بار[ص:۳۰]اور یہ مقدمہ وحواشی آج تک شائع نہیں ہوئے۔

اس اشاعت کے شروع کے آٹھ صفحات: سرورق، کتابی کوائف، حرفے چند اور تعارف پر مشتمل ہیں۔نسخے کا متن ۷۸صفحات کو محیط ہے، گویا خطی نسخہ ۷۸صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخۂ خدابخش، دیباچۂ غالب اور تقریظ نیّر سے عاری ہے، ترقیمہ بھی نہیں ہے۔پہلا صفحہ ''رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وتمم بالخیر'' کے بعد شروع ہوگیا ہے۔فوری طور پر میں نے صفحۂ اول اور آخر کی عبارت کا طبع اول سے ملان کیا تو پہلی غزل کے بعد کا شعر:

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد! اسد غم خوارِ جانِ درد مند آیا

نسخے میں نہیں پایا۔آخری صفحے پر بھی رباعیات کی ترتیب متداول دیوان کے مطابق نہیں۔آخری رباعی سے پیشتر تمام شد لکھا ہے۔میرا خیال ہے کہ تدوین کے نقطۂ نظر سے اس نسخے کی کوئی خاص اہمیت نہیں؛ ورنہ قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام وغیرہ کی توجہ کا مرکز یہ ضرور بنا ہوتا۔تاہم اس کی اشاعت کی اپنی اہمیت ہے۔

۲-دیوانِ غالب[نسخۂ خواجہ] ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مکتبۂ اعجاز، لاہور، ۱۹۹۸ء، صفحات: ۳۵۲، بار اول

دیوان غالب نسخۂ خواجہ، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار پبلی کیشنز، لاہور۔اگست ۲۰۰۰ء صفحات: ۲۳۶

بار دوم، ڈیلکس ایڈیشن۔راقم الحروف کے پیش نظر یہی ایڈیشن ہے۔دراصل یہ نسخۂ لاہور ہے جو بقول عرشی ۱۸۵۲ء کے آخر میں مرتب کیا گیا۔یہ پنجاب یونیورسٹی پنجاب لائبریری کی ملکیت تھا۔وہاں سے یہ غائب ہوگیا۔کسی طرح یہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن [ف: ۲۰۰۵ء] کے ہاتھ لگا اور انھوں اسے نسخۂ خواجہ کے نام سے مرتب کر کے شائع کردیا۔

جس طرح 'بیاض غالب بخط غالب' کی اشاعت کے بعد ماہرین غالب کے درمیان نسخے کی صحت وعدم صحت پر بحث برپا ہوئی تھی، اسی طرح اس نسخے کی اشاعت کے بعد بھی لاہور

کے اخبارات ورسائل میں ایک طویل بحث چھڑ گئی۔ بحث کا موضوع تھا کہ یہ نسخۂ لاہور ہے، ماضی میں جس کا تعارف اردو کے بڑے محققین ڈاکٹر سید عبداللہ [دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ، مطبوعہ ماہنامہ 'ماہ نو' کراچی جولائی ۱۹۵۴ء] قاضی عبدالودود [متفرقات ،نقوش لاہور اکتوبر ۱۹۵۸ء] امتیاز علی خاں عرشی [نسخہ لاہور مشمولہ دیوان غالب نسخۂ عرشی ، دہلی ۱۹۵۸ء] کرا چکے ہیں۔ جب کہ سید معین الرحمٰن کا دعویٰ تھا کہ یہ مخطوطہ ان کے ذاتی ذخیرۂ نوادر کا حصہ ہے۔ انھوں نے یہ پرانی کتابوں کے کسی بیوپاری سے خرید کر اپنے ذاتی ذخیرے میں شامل کیا تھا۔ [حرفے چند ص:۱۰] ان کے دعوے کے رد میں جو چھوٹے بڑے رسائل اور جوابات شائع ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ، تجزیہ وتحسین، مرتبین: ڈاکٹر سید معراج نیر، اصغر ندیم، الوقار پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۰ء [یہ کتاب ۵ رنومبر ۱۹۹۹ء کو ڈاکٹر معین الرحمٰن کی ستاون ویں سالگرہ پر پیش کی گئی تھی]

۲۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق ڈاکٹر تحسین فراقی، بک وائز لاہور ۲۰۰۰ء ص:۸۲

۳۔ دیوان غالب نسخہ ٔخواجہ یا نسخۂ مسروقہ۔ایک جائزہ، سید قدرت نقوی، مکتبۂ تخلیق ادب کراچی ۲۰۰۰ء ص:۴۸

۴۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ صحیح صورت حال، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار پبلی کیشنز لاہور، مئی ۲۰۰۰ء ص:۶۴

۵۔ دیوان غالب نسخۂ خواجہ اصل حقائق ،از ڈاکٹر تحسین فراقی اور دیوان غالب نسخہ خواجہ صحیح صورت حال از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ایک تقابلی جائزہ، مولفہ ڈاکٹر عارف ثاقب، اظہار سنز لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء ص:۱۶

مذکورہ بالا تحریری بحث میں نسخہ خواجہ کو کتب خانۂ پنجاب یونیورسٹی کا گم شدہ نسخہ، نسخۂ لاہور قرار دیا گیا اور کتب خانے سے اس کے گم ہونے اور مرتب کے ذریعے اس کی اشاعت کو ان کی ادبی خیانت سے تعبیر کیا گیا۔

یہ نسخہ ۶۴ اوراق یعنی ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۵۴۸ اشعار ہیں۔ بشمول دیباچۂ غالب وتقریظ ،غزلیات ، قصائد، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ عرشی صاحب کی رائے ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کے نصف آخر میں مرتب کیا گیا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ترتیب سے یہ پہلی بار چھپ کر شائع ہوا۔

مرتب نے اسے انگریزی و اردو ادبیات کے عالم پروفیسر خواجہ منظور حسین (ف ۱۹۸۶ء) سے منسوب کرتے ہوئے 'نسخہ خواجہ' نام دیا (تعارف: ۱۶) وہ لکھتے ہیں: ''اس نسخے کی جدول چھ رنگ کی ہے۔ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک مطلا اور مذہب خوشنما بیل بوٹے، انتہائی دیدہ زیب باریک نفیس طلائی کام سے مزین'' (تعارف: ٦) آگے مزید لکھتے ہیں: ''نسخہ خواجہ جو اپنے وقت میں بڑے مثالی اہتمام اور کاوش کے ساتھ تیار ہوا ہے اغلب ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد نیر ورخشاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہر گم گشتہ ہو'' (تعارف: ۱۹) لیکن پروفیسر حنیف نقوی کا خیال ہے:

> ''میرے نزدیک ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا شائع کردہ یہ نسخہ وہ گم شدہ دیوان ہے جو غالب نے جانی بانکے لال رند وکیل بھرت پور کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے خاص اہتمام سے تیار کرایا تھا۔۔۔ یہ نسخہ ۱۷ ردسمبر ۱۸۵۲ء کو بہ سبیل ڈاک رند کے نام روانہ کیا گیا تھا''
>
> (دیوان غالب تجزیہ و تحسین: ۳۹)

سید صاحب نے اس اشاعت کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شروع کے ۴۴ صفحات متعدد عنوانات: حرفے چند، تقدیمات، مخطوطے کا تعارف وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ درمیان کے ۱۲۸ صفحات مطلا اور مذہب نسخے کے عکس اور آخر کے ۶۴ صفحات بہ عنوان، اضافات مرتب: نسخے سے متعلق حواشی، دیباچۂ غالب اور تقریظ دیوان غالب کا اردو ترجمہ، فہرست اشعار، اشاریے اور انگریزی میں نسخۂ خواجہ کے تعارف وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ مکمل دیوان آرٹ پیپر شائع کیا گیا ہے۔ نسخے کی ہو بہو رنگین کاپی شائع کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے غالب صدی کے بعد اتنا خوبصورت نسخہ دیوان غالب کا ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

۳۔ نسخۂ حمیدیہ ڈیجیٹل کاپی: یہ نسخہ مرزا نے ۱۸۲۱ء میں نقل کرایا جو ۵ رصفر ۱۲۳۷ھ / یکم نومبر ۱۸۲۱ء کو مکمل ہوا اور ریاست بھوپال کے فوجدار محمد خاں (ف ۱۸۶۵ء) کی ذاتی ملکیت بنا۔ یہ نسخہ ان تک کب اور کس طرح پہنچا اس سلسلے میں ابھی تک کوئی مصدقہ شہادت دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ اہل علم کو اس کا پتہ چلا، اس وقت یہ نسخہ ریاست کے فرماں روا نواب حمید اللہ خاں (ف ۱۹۶۰ء) کے ذاتی کتب خانے کا حصہ تھا۔ انہی دو شخصیتوں سے نسبت کے سبب اول: یہ نسخۂ بھوپال اور پھر نسخۂ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ نسخہ مفتی محمد انوار الحق (ف ۱۹۴۰ء) کی

ترتیب سے پہلی بار'دیوان غالب جدید' کے نام سے مفید عام پریس آگرہ سے چھپ کر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔اس نسخے میں وہی کلام تھا جس کی بابت مرزا نے دیوان کے دیباچے میں لکھا تھا:

''شاعروں کے قدر شناس قارئین سے توقع ہے کہ وہ اُن پراگندہ ابیات کو
جو اس دیوان سے خارج ہیں، عاصی کی تراوشِ قلم کا نتیجہ نہ سمجھیں اور ایسے
اشعار کی تعریف وتعریض میں اس دیوان کے مرتب (غالب) کو ممنون و
ماخوذ نہ ٹھہرائیں''

لیکن مفتی صاحب نے اس میں متداول دیوان کا کلام بھی شامل کر دیا۔اس طور جملہ کلام گڈ مڈ ہوگیا۔کلام کی تاریخی ترتیب طے کر پانا مشکل ہوگئی بعد میں پروفیسر حمید احمد خاں (ف ۱۹۷۴ء) نے اسے از سر نو اصل کے مطابق مرتب کر کے ۱۹۶۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا۔

جنوری ۱۹۴۴ء تک یہ نسخہ کتب خانۂ حمیدیہ میں موجود تھا اور اس سے بعض بڑے محققین نے استفادہ کیا،لیکن بعد کے عرصے میں یہ وہاں سے گم ہوگیا۔۲۰۱۵ء میں یہ ڈھاکہ کے جناب شہاب ستار کو لندن میں پرانی کتابوں کے ایک بیوپاری سے حاصل ہوا جس کی انھوں نے مہر افشاں فاروقی کی وساطت سے ڈیجیٹل کاپی تیار کی،اس کی ہندوستانی قیمت چھ ہزار روپے قرار پائی۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے یہ کاپی خریدی جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ظفر احمد صدیقی نے ایک مقالہ بہ عنوان ''نسخۂ حمیدیہ دریافت، گم شدگی، بازیافت'' بھی لکھا جو معارف مئی ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔سطور ذیل میں اس ڈیجیٹل کاپی کا پہلی مرتبہ تعارف پیش کیا جا رہا ہے:

۸۰۵۰×۱۱،انچ کا ۲۸۱ صفحات (۸+۲۴۱+۲۲) پر مشتمل ڈیجیٹل نسخہ اصل کے مطابق پیش کیا گیا ہے؛یعنی سائز کے لحاظ سے اور دستیاب نسخے کے کاغذ کے رنگ کو بھی (جو مٹ میلا ہو چکا ہے) ہو بہو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اس نسخے پر صفحات نمبر کا اہتمام نہیں تھا،لہٰذا اس پر نمبر شمار بھی نہیں دیے گئے۔ٹائٹل پر فوجدار محمد خاں کی مہر، مرزا کا فوٹو،مہر افشاں فاروقی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے سرنامہ یہ بنا گیا ہے:

مرزا اسداللہ خاں غالب کے اصل مخطوطۂ دیوان کی ڈیجیٹل شکل/'نسخۂ حمیدیہ'/ حافظ معین الدین خطاط نے ۱۸۲۱ میں رقم کیا/ مع تعارف از مہر افشاں فاروقی۔ سرورق پر یہ اضافہ ملتا ہے''غالب کے عہد شباب کا دیوان'' اور مہر افشاں فاروقی کے نام کے نیچے درج ہے: ڈپارٹمنٹ

آف مڈل ایسٹرن اینڈ ساؤتھ ایشین لینگویجز اینڈ کلچر، یونیورسٹی آف ورجینیا'' [مہرافشاں فاروقی کے تعارف میں یہ لکھنا کافی ہوگا کہ وہ اردو کے معروف نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی بیٹی ہیں]

سرورق کے بعد کے صفحے پر کتابی کوائف کی طرح کاپی رائٹ [۲۰۱۵ء یعنی سال اشاعت] آئی ایس بی این نمبر وغیرہ کا اندراج ہے۔ تیسرا صفحہ انتساب کے لیے مخصوص ہے جو جناب شہاب ستار نے اپنے والد، اے ستار کے نام کیا ہے۔ اس پر تاریخ اکتوبر ۲۰۱۵ء درج ہے۔ تاریخ کے نیچے ڈھاکہ لکھا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ ۲۰۱۵ یا اس سے پہلے کے عرصے میں دستیاب ہوا تھا اور اس پر کام قیام ڈھاکہ کے دوران شروع ہوگیا تھا۔ اگلے تین صفحات پیش لفظ کے لیے مختص ہیں جو جناب شہاب ستار نے لکھا ہے اس پر بھی تاریخ اور جگہ کا اندراج حسب سابق ہے۔ آگے کے ۱۲ صفحات مہر افشاں فاروقی کے مقدمے بہ عنوان ''غالب کے ۱۸۲۱ء کے دیوان کی تاریخ'' [مترجم ظفر سید] شامل ہے۔ اس کے بعد ۲۴۱ صفحات پر مشتمل عکس ہے آخر کے ۲۲ صفحات میں نیا انگریزی سرورق، کتابی کوائف، انتساب، پیش لفظ، اور مقدمے کا انگریزی متن ہے۔

اس نسخے کی اشاعت سے بہت سے اختلافات ازخود حل ہو جائیں گے جیسا کہ مہر افشاں فاروقی نے بھی اپنے مقدمے میں انتہائی عالمانہ انداز میں اس پر گفتگو کی ہے۔

دیوان غالب و منتخبات کے عکسی ایڈیشن:

غالب کی زندگی میں دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن چھپ کر شائع ہوئے:

۱۔ دیوان غالب
سید المطابع دہلی، اکتوبر ۱۸۴۱ء
تعداد اشعار ۱۰۹۳

۲۔ دیوان غالب
مطبع دار السلام دہلی
مئی ۱۸۴۷ء
تعداد اشعار ۱۱۵۸

۳۔ دیوان غالب
مطبع احمدی دہلی

جولائی ۱۸۶۱ء

تعداد اشعار ۱۷۹۶

۴۔ دیوان غالب

مطبع نظامی کانپور

جون ۱۸۶۲ء

تعداد اشعار ۱۸۰۲

۵۔ دیوان غالب

مطبع مفید خلائق آگرہ

بعد از جون ۱۸۶۳ء

تعداد اشعار ۱۷۹۵

عام طور پر غالب کے متداول دیوان میں ۱۷۹۶ یا ۱۸۰۲، اشعار ملتے ہیں۔ یہ تمام اشعار ۱۸۵۵ء تک کہے گئے اشعار سے انتخاب کیے گئے ہیں، اسی لیے ان دواوین کی اہمیت ہے، چونکہ ان دواوین کے نسخے کمیاب و نایاب ہیں، اس لیے ان کی عکسی اشاعتوں کی اہمیت محسوس کی گئی۔ کالی داس گپتا رضا (ف ۲۰۰۱ء) کے ذاتی ذخیرۂ کتب میں کلام غالب کی جملہ اشاعتیں موجود تھیں، لہٰذا انھوں نے دو کی عکسی اشاعتیں اپنے پیش لفظ کے ساتھ چھپوا کر شائع کر دیں۔

۱۔ دیوان غالب (عکسی) طبع اول، ناشر: ول پبلی کیشنز۔ بمبئی، ۱۹۸۶ء ص: [۱۶+۱۱۰] = ۱۲۶

چھ صفحات پر مشتمل پیش لفظ میں کالی داس گپتا رضا نے اس دیوان سے متعلق جملہ تفصیلات سے مطلع کیا ہے۔ اس شاعت کا انتساب مالک رام [ف: ۱۹۹۳ء] کے نام کیا گیا ہے۔

۲۔ دیوان غالب چوتھا ایڈیشن، مطبع نظامی کانپور، جون جولائی ۱۸۶۲ء (عکسی) ول پبلی کیشنز۔ بمبئی، ۱۹۸۷ء ص: [۲۴+۱۰۴] = ۱۲۸ انتساب ڈاکٹر گیان چند جین [۲۰۰۷ء] کے نام ہے۔ پیش لفظ ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں غالب کے دیوان کی جملہ اشاعتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ دیوان کا متن ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ پیش لفظ میں مرتب نے لکھا ہے:

> ''ان میں پہلا ایڈیشن اور چوتھا ایڈیشن نہایت اہم ہیں۔ پہلا اس لیے کہ یہ نہایت کمیاب ہے۔ (ظاہر ہے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے کم شعر

ہیں) نیز یہ غالب کی مطبوعہ اردو شاعری کے سفر میں پہلا قدم ہے؛ اور چوتھا اس لیے کہ اس میں سب ایڈیشنوں سے زیادہ شعر ہیں اور اس کی بنیاد تیسرے ایڈیشن کا وہ نسخہ ہے جو خود غالب نے اپنے قلم سے درست اور نظر ثانی کر کے اشاعت کے لیے دیا تھا'' (ص:۱۶)

آگے مزید لکھتے ہیں:

''اس ایڈیشن میں وہ تمام (۱۷۹۶) اشعار لیے گئے ہیں جو تیسرے ایڈیشن میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ چھ شعروں کا اضافہ بھی کر دیا، اس طرح اس ایڈیشن کے کل اشعار ۱۸۰۲ ہو گئے اور غالب کا یہی کلام متداول ہے (ص:۱۶)

عکسی اشاعت کے مطالعے سے پتہ چلا کہ طبع اول بنا جدول شائع ہوا تھا اس اشاعت میں جدول کا اہتمام ملتا ہے۔ اس کے علاوہ غزلیات پر نمبر شمار بھی دیے گئے ہیں۔ نیّر کی تقریظ اس میں شامل نہیں ہے آخری صفحے پر ''خاتمۃ الطبع'' کے عنوان سے مطبع نظامی کانپور کے مالک محمد عبد الرحمٰن کا ایک نوٹ ہے اور خواجہ طالب حسین طالب کا ایک تاریخی قطعہ ہے۔ اس کے بعد مالک مطبع کے دستخط اور مہر ہے۔

۳۔ دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۶۳ء (عکسی) مقدمہ حکیم سید ظل الرحمٰن، ناشر ابن سینا اکاڈمی علی گڑھ

اشاعت: ۲۰۱۶، ص: [۱۴۶+۲۲] = ۱۶۸

یہ غالب کی زندگی میں شائع ہونے والا آخری دیوان ہے۔ جو ان کی وفات سے چھ سال قبل ۱۸۶۳ء میں مطبع مفید عام خلائق آگرہ سے ۱۴۶ اصفحات پر چھپ کر شائع ہوا تھا۔ یہ مع دیباچہ و تقریظ نیّر [فارسی] قطعات، مثنوی، قصائد، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے اشعار کی تعداد ۱۷۹۵ ہے۔ عرشی صاحب نے اس اشاعت کی بابت لکھا ہے:

اس نسخے کی یہ خصوصیت قابل بیان ہے کہ پوری کتاب میں کچھ مقامات کے سوا، یائے معروف و مجہول اور ہائے سادہ و مخلوط میں فرق کیا گیا ہے۔ شاید اس سے پہلے کسی مطبوعہ کتاب میں یہ التزام نہیں۔''

(دیوان غالب نسخہ عرشی، ص:۱۴۴)

حکیم سید ظل الرحمٰن فاؤنڈر ابن سینا اکیڈمی کے ذاتی ذخیرے میں یہ نسخہ موجود تھا۔

انھوں نے اول اس کا عکس سہ ماہی 'سورج' لاہور میں شائع کرایا [سالنامہ اکتوبر ۲۰۰۶ء] بعدازاں ایک مقدمہ لکھ کر اس کا عکسی ایڈیشن اپنے ادارے سے شائع کیا۔ یہ دیوان ۱۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے ۲۲ صفحات کتابی کوائف اور مقدمے کے لیے وقف ہیں۔ اس ایڈیشن کا انتساب ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے نام کیا گیا ہے۔

۱۵ صفحات پر مشتمل مقدمے میں مرتب نے دیوانِ غالب کی جملہ اشاعتوں کا تعارف کراتے ہوئے اس عکسی ایڈیشن کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس امر سے بھی مطلع کیا کہ:

> ''اس کا عکس 'سورج' میں بہت صاف نہیں چھپا تھا۔ میں نے مسلم ایجوکیشنل پریس کے مالک شجاع الدین سے اس کی صفائی کا خاص خیال رکھنے کے لیے کہا۔ یہ ان کی تعریف کی بات ہے کہ انھوں نے پھیلی ہوئی سیاہی اور دھبوں کو جہاں تک ہو سکا دور کیا۔ بعض اشعار جو تجلید کی نذر ہو گئے تھے، اسی طرح جگہ جگہ جو حروف ٹوٹ گئے تھے اور چھاپے میں صاف نہیں آئے تھے انھیں بڑی محنت سے ابھارنے کی کوشش کی۔ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۶۲ء کی عکسی اشاعتوں میں بھی چھاپے کی صفائی اور اُڑے ہوئے حروف کے بنانے پر توجہ نہیں کی گئی تھی۔ (ص ۲۰)

حکیم صاحب کا یہ بیان بالکل درست ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر تصانیف غالب کے بیشتر عکس موجود ہیں۔ یہ دیوان صفائی اور درستگیِ الفاظ کے لحاظ سے ان سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ یہ ڈیجیٹل پرنٹنگ کے عہد میں چھپا ہے۔

۳۔ گل رعنا مع آشتی نامۂ غالب، مرتبہ سید قدرت نقوی، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۵ء
صفحات: [۱۲+۳۵۸+۱۲۰]=۴۹۰

اس نسخے پر حرفے چند جمیل الدین عالی [ف: 2015ء] نے لکھا ہے اور مقدمہ مرتب نے۔ یہ مرزا غالب کا اردو و فارسی کلام کا پہلا انتخاب ہے جو انھوں نے مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا۔ پیش نظر نسخے کی ترتیب کے وقت 'گل رعنا' کے پانچ مخطوطے معلوم اور چار دستیاب تھے۔ [۱] نسخۂ حسرت موہانی [۲] نسخۂ بلگرامی [۳] نسخۂ خواجہ [۴] نسخۂ سُویدا [۵] نسخۂ وصی احمد یعنی زیرِ نظر مخطوطہ۔ نسخۂ حسرت عدم دستیاب ہے۔ دوسرا مالک رام کی ترتیب سے علمی مجلس دہلی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ تیسرے اور چوتھے نسخے کی روشنی میں سید وزیر الحسن عابدی

نے[ف:۱۹۷۹ء] متن مرتب کیا جسے ادارۂ تحقیقات پاکستان لاہور نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ پانچواں نسخہ سید وصی احمد بلگرامی[۱۹۷۶ء] کی ملکیت تھا جسے مشفق خواجہ [ف:۲۰۰۵ء] نے حاصل کر کے سید قدرت نقوی (ف ۲۰۰۰ء) سے مرتب کرایا۔ اس میں غالب کا اردو کلام کا انتخاب شامل ہے، جس میں ۴۵۴ شعر ہیں۔ مالک رام کے یہاں یہ تعداد ۴۵۵ اور عابدی کے یہاں ۴۷۷ ہے۔ یہ اشاعت مالک رام اور عابدی صاحب کی اشاعتوں سے اس لحاظ سے وقیع ہے کہ اس میں گل رعنا کے مخطوطۂ پنجم کا عکس بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

اس مخطوطے کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ تھا۔ جلد بندی کے بعد کچھ فرق واقع ہو گیا۔ کل اوراق ۶۲ یعنی ۱۰۴ صفحات ہیں۔ صفحات شماری بعد میں کی گئی ہے۔ اردو اشعار کا اندراج صفحہ ۸ سے صفحہ ۵۰ کو محیط ہے۔ کلام دو کالم میں بغیر جدول ترچھا انداز اختیار کرتے ہوئے خوبصورت پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اس مخطوطے کا عکس بہت صاف اور واضح ہے۔

۳۔ غالب کے دیوان اور انتخاب کی تاریخی تدوین:

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو دیوان غالب کی تاریخی تدوین مولانا عرشی نے اپنی مرتبہ اشاعتوں ۱۹۵۸، اور ۱۹۸۲ء نسخۂ عرشی میں کر دی تھی، لیکن یہ عنوان بندیا ابواب بندی تھی یعنی نسخۂ عرشی کو انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا: گنجینۂ معنی، نوائے سروش، یادگار نالہ پہلے عنوان کے تحت صرف نسخۂ حمیدیہ و شیرانی کے اشعار جمع کیے، دوسرے کے تحت دیوان متداول کے اور تیسرے کے تحت وہ اشعار دیے جو نسخوں کے متن میں نہیں بلکہ حاشیوں، خطوط، بیاضوں یا خاتمے سے لیے گیے۔ کلام کی تاریخوں کا اندراج کلام کے ساتھ نہ کر کے حواشی میں کیا۔ کالی داس گپتا رضا نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے اس پورے دیوان کو تاریخی ترتیب میں سلسلہ وار مرتب کر دیا۔ یہ ایک نوعیت کا علاحدہ کام تصور کیا گیا اور پسند کیا گیا۔ اس سلسلے کے ان کے مرتبہ نسخے کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، باراول ۱۵/فروری ۱۹۸۸ء صفحات: ۴۰۰

اس دیوان کا انتساب مرتب نے اپنی اہلیہ ساوتری کالی داس گپتا کے نام کیا ہے۔ شروع میں طویل مقدمہ ہے[ص:۱۱ تا ۱۰۹] متن میں ۴۲۰۹ شعر پیش کیے گئے ہیں۔ ترتیب گیارہ ادوار میں کی گئی ہے۔ پہلا دور ۱۸۰۷ تا ۱۸۱۲ء اور گیارہواں دور ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۷ء ہے۔ آخر میں

اشاریے [فہرست اشعار، اشخاص، کتب ورسائل مقامات] دیے گئے ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے ۱۹۹۰ء میں اسے پاکستان سے شائع کیا۔

۲۔ طبع دوم ہمارے پیش نظر نہیں۔ لیکن یہ ہندوستان میں ۱۹۹۰ء میں اور پاکستان میں ۱۹۹۴ء میں طبع ہوا تھا۔ رضا نے طبع سوم میں لکھا ہے: ''اگرچہ دوسرے ایڈیشن میں بھی رد و بدل کیا گیا تھا مگر وہ کچھ ایسا نمایاں نہ تھا۔ (ص:۹)

۳۔ دیوان غالب کامل نسخۂ گپتا رضا (تاریخی ترتیب سے) کالی داس گپتا رضا، ساکار پبلی کیشنز بمبئی، ۱۵ر فروری ۱۹۹۵ء (ترمیم و اضافوں کے ساتھ) صفحات: ۵۶۴

اس کی ترتیب بھی ماقبل کے ایڈیشن کے مطابق ہے، البتہ اس میں مرتب نے خاصے اضافے کیے ہیں۔ طبع اول میں اختلاف نسخ کو محض اس لیے واضح نہیں کیا گیا تھا کہ یہ کام بہ طریق احسن، عرشی صاحب انجام دے چکے تھے۔ املا اور روایت اشعار بھی پیشتر نسخۂ عرشی کے مطابق تھے، لیکن اس اشاعت میں انھوں نے اپنے طور پر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ عرشی صاحب کا اعتراف قدم قدم پر کیا ہے، لیکن درجۂ اول کے ۱۹ ماٰخذ میں سے ۸ ماٰخذ سے استفادہ بتوسط نسخۂ عرشی ہی کیا ہے۔ اس ایڈیشن کا مقدمہ ۱۱۳ صفحات کو محیط ہے۔ مقدمے میں انھوں نے ترتیب سے متعلق سارے اہم مسائل پر گفتگو کی ہے اور حتی الوسع اسے حتمی شکل دینے کی سعی کی ہے۔ مقدمہ ہی میں توقیت کا اضافہ کیا ہے۔ مقدمہ میں اختیار کردہ عنوانات سے اس اشاعت کی اہمیت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

کلام غالب کی تاریخی ترتیب کیوں، تعارف، غالب کا اولین اردو منظوم کلام، عمدۂ منتخبہ میں ذکر غالب، حرف نامعتبر، غالب کے بعض غیر متداول اشعار کا زمانۂ فکر، غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور اشعار، دیوان غالب طبع اول، غالب کی زندگی میں دیوان غالب کی اشاعت، (دیباچہ، تقریظ، خاتمۃ الطبع اور تعداد اشعار) توقیت غالب۔

مقدمے کے بعد دیوان غالب کا متن حسب سابق گیارہ ادوار میں نقل کر دیا گیا ہے۔ طبع اول میں پہلے دور کا آغاز ۱۸۰۷ء سے کیا تھا۔ اس شاعت میں اس سنہ کو حذف کر کے ڈیش لگا دیے گئے ہیں۔ آخر میں فہرست اشعار بہ لحاظ سال فکر اور بہ لحاظ حروف تہجی (قافیہ و ردیف) کا اضافہ کیا ہے۔ اشاریۂ اشخاص، کتب، مقامات کے علاوہ غالب کی چار تصویریں بھی دی ہیں۔ اس اشاعت کا پاکستانی ایڈیشن انجمن ترقی اردو کراچی نے ۱۹۹۶-۱۹۹۷ء میں شائع کیا

جس پر جمیل الدین عالی کا پیش لفظ ہے۔ انجمن نے اس کا چوتھا ایڈیشن ۲۰۱۲ء میں بھی شائع کیا ہے۔

۴۔ انتخاب کلام غالب، مسعود حسین، سر سید بک ڈپو علی گڑھ اول ۱۹۹۱ء صفحات: ۲۲۴

غالب کے کلام کے متعدد انتخاب ہند و پاک میں شائع ہو چکے ہیں لیکن یہ انتخاب پروفیسر مسعود حسین خاں (ف ۲۰۱۰ء) ماہر لسانیات کی تراوش فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنے چچا اور غالب شناس ڈاکٹر یوسف حسین خاں (ف ۱۹۷۹ء) کے نام کیا ہے۔ شروع میں 'پیش کلام' کے عنوان سے سات صفحے پر مشتمل ایک دیباچہ ہے جس میں انھوں نے اس انتخاب کو مرتب کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''غالب کے مکمل مجموعۂ کلام کی تدوین کا کام تو امتیاز علی عرشی مرحوم اور کالی داس گپتا رضا اپنے اپنے انداز میں انجام دے چکے ہیں۔ ''تاریخ وار مکمل انتخاب'' کا بیڑا راقم السطور نے اٹھالیا۔ اس عمل میں غالب کے دیوان کی ضخامت تقریباً وہی رہی جو متداول دیوان کی ہے۔
>
> ہر چند اس انتخاب کی تاریخی ترتیب کا دعوائے ادوار (نسخۂ عرشی کے انداز پر) یا تاریخ وار (کالی داس گپتا رضا کے اہتمام کے مطابق) کہیں نہیں کیا ہے، اس لیے کہ ان دونوں گراں قدر تالیفوں کی موجودگی میں یہ محض ایک تکراری عمل ہوتا؛ تاہم غالب شناس دیکھیں گے کہ اس انتخاب میں بھی غالب کا کل کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ ردیف وار پیش کیا گیا ہے۔ قصائد، قطعات اور رباعیات کی ترتیب میں تاریخی التزام قائم رکھا گیا ہے، اس طرح کہ ایک نظر میں غالب کے ذہنی ارتقا کی ترسیم کا اندازہ ہو جاتا ہے۔'' (ص: ۶، ۷)

راقم الحروف کا خیال ہے کہ ایک ماہر لسانیات اور ناقد ادب کے قلم سے کیا گیا انتخاب غالب کی فکر و فن کی ارتقائی صورت کو سمجھنے کا یقیناً ایک بہتر وسیلہ بنے گا، لیکن کلام کے ساتھ سال فکر کا اندراج نہ کرنے سے یہ مقصد کیوں کر حل ہو سکتا ہے، میں نہیں سمجھ سکا۔ البتہ مرزا خلیل بیگ کی کتاب 'مسعود حسین خاں احوال و آثار' (دہلی ۲۰۱۵ء) کے مطالعے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے جامعۂ اردو علی گڑھ کے ادیب کامل کے طلبہ کے لیے یہ انتخاب کیا تھا (ص: ۱۴۴) لیکن دیباچے

میں اس طرح کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ دیباچے میں جس طرح غالب کے قلمی مخطوطوں کا ذکر کیا ہے اس سے اس انتخاب کی حیثیت تحقیقی ہو جاتی ہے نہ کہ تدریسی۔ واللہ اعلم

دیوان غالب سے متعلق یہ ہیں وہ چند تحقیقی کارگزاریاں جن میں سے ہر ایک مستقل جائزے کی حامل ہے۔ پچھلے پچاس سال کے دوران ہند و پاک میں دیوانِ غالب کے درجن بھر سادہ ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں جن کے مرتبین یا ان کو شائع کرنے والے ادارے ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان کا تعارف پھر کبھی۔ اس مختصر مقالے کو دیوان غالب کی چند قابل ذکر اور اپنی نوعیت کی جدا اشاعتوں کے تعارف تک محدود رکھا گیا۔

○

محمد مشتاق تجاروی

کالی داس گپتا رضا کی غالب شناسی

کالی داس گپتا رضا (۱۹۲۵ـ۲۰۰۱) اردو زبان وادب کے شناور اور میدان تحقیق کے شہسوار تھے، انھوں نے ساری زندگی گیسوئے اردو کی زلف وکاکل سنوارنے میں گزاری، وہ معروف معنوں میں اردو کے آدمی نہیں تھے، نہ کسی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے، نہ کسی اردو اکیڈمی یا اردو ادارے سے وابستہ تھے۔ اردو دراصل ان کا شوق ان کی محبت اور ان کا جنون تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان ان کا وسیلہ معاش یا وسیلہ عزت وسرفرازی نہیں بلکہ ان کا پیشن Passion تھی۔ انھوں نے اپنے پیشے اور پیشہ وارانہ بلکہ ساہوکارانہ تنگنائے میں سے اردو کی ایک شاہراہ نکالی اور ساری زندگی اس پر گامزن رہے۔

کالی داس گپتا رضا اردو کے بہترین شاعر تھے ان کے ۸ مجموعے شائع ہوئے، شعری ذوق بھی بہت معیاری تھا، انھوں نے بعض شعرا کے کلام کا انتخاب بھی کیا، غالب کے دیوان کی تاریخی ترتیب بھی ان کی شعری ذوق کا آئینہ دار ہے، نثر میں بھی انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، نثر میں ان کا اصل میدان تحقیق تھا اور اس میں بھی غالب شناسی تھا۔ تاہم دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں ان کی کتابوں کی تعداد کم وبیش ڈھائی درجن ہے۔ ساتھ ہی ان کے

متعدد مقالات ہیں جو اردو کے معیاری ادبی رسائل کی زینت بنے۔

کالی داس گپتا رضا کے اجداد ہریانہ کے ضلع حصار کے رہنے والے تھے، چند پشت پہلے تلاش روزگار میں پنجاب کے ضلع جالندھر میں مکند پور پہنچے، یہاں قسمت نے یاوری کی اور یہاں ان کا کاروبار بہت پھیلا، ان کے بزرگوں میں اردو فارسی کی روایت نہیں تھی غالباً ان کے والد خاندان کے پہلے فرد تھے جنھوں نے اردو سیکھی، والد سے یہ ذوق ان کو بھی ملا، بچپن سے ہی طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی، والد صاحب کی تشویق کے ساتھ یہ ذوق پروان چڑھا تو اردو کے مایہ ناز شاعر جوش ملسیانی کی خدمت میں بغرض اصلاح حاضر ہوئے، مشق سخن کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا، میٹرک تک باضابطہ تعلیم حاصل کی۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی کامل اور منشی فاضل بھی دیے لیکن باضابطہ طور پر ان کی تعلیم میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکی اس کے بعد والد کے اصرار پر وطن سے دور سمندر پار افریقہ کا سفر کیا۔ یہ سفر ان کے لیے بڑا خوش آئند ثابت ہوا انھوں نے نیروبی میں جا کر تجارت شروع کی اور اس میں کامیاب رہے۔ اسی دوران کو ایک دوسرا انعام یہ ملا کہ تنزانیہ کے ایک کامیاب تاجر لاجپت رائے گپتا کی صاحبزادی ساوتری دیوی سے ان کی شادی ہوگئی۔

نیروبی میں کم وبیش دو دہائی سے زیادہ تجارت کرنے کے بعد وطن کی کشش ان کو ہندوستان لے آئی اور وہ ۱۹۷۰ کے قریب بمبئی منتقل ہوگئے، یہاں تقریباً ۳۰ سال تک تجارت اور اس کے ساتھ علمی وادبی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بعد ۲۱ مارچ ۲۰۰۱ میں ان کا انتقال ہوگیا، انتقال دہلی میں ہوا۔ دراصل راشٹرپتی بھون میں ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہونی تھی وہ اسی میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ یہیں حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کی وفات ہوگئی۔

کالی داس گپتا رضا افریقہ میں رہے اور تجارت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ خوب دولت کمائی، بقول گیان چند لاکھوں کروڑوں میں کھیلے لیکن اردو سے ان کا عشق ان کی ہر مشکل سے طاقت ور نکلا اور انھوں نے اپنے دل میں اور اپنے گھر میں اردو کی قندیل روشن رکھی، شاعری بھی کرتے رہے اور بکثرت مطالعہ کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی تعلیم کی کمی کو ذاتی مطالعہ اور لگن سے مکمل کرلیا، اپنے گھر میں انھوں نے نہایت قیمتی کتب خانہ مرتب کیا جس میں ہزاروں کتابیں تھیں، تحقیق کے لیے مخطوطات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے انھوں نے مخطوطات کا بھی وسیع مطالعہ کیا

اور خود بھی کم وبیش ۵۰۰ مخطوطات جمع کیے، ان کو اگر کسی مخطوطے کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ یہ برائے فروخت ہے تو ہر قیمت پر اس کو خرید لیا کرتے تھے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان کے ذوق مطالعہ اور ذوق کتب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''نو دس گھنٹے روزانہ وہ تحقیق اور مطالعہ کتب میں گزارتے تھے ان کے ذاتی کتب خانے میں چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے تھے، مخطوطات سے بڑا شغف تھا کوئی مخطوطہ مل جاتا تو ہر قیمت پر اسے خرید لیتے، ان کے کتب خانے میں پانچ سو سے زیادہ قلمی کتابیں تھیں، غالبیات پر اتنا بڑا ذخیرہ اور کسی کتب خانے میں نہیں ہوگا''1

اردو زبان سے گہرے شغف اور کثرت مطالعہ نے ان کو اردو کے صف اول کے محققین میں شامل کر دیا وہ خود تو پی ایچ ڈی کیا بی اے پاس بھی نہیں تھے لیکن ان پر متعدد لوگ پی ایچ ڈی ہو گئے اور ان کے فکر وفن پر اردو اور انگریزی میں ایک درجن سے زیادہ کتابیں، رسالوں کے خصوصی نمبر اور خصوصی گوشے شائع ہوئے۔

کالی داس گپتا رضا نے چکبست اور جوش ملسیانی پر پائیدار اور حوالہ جاتی کام کیا ہے اس کے ساتھ انھوں نے چند اور تحقیقی کام کیے ہیں جن میں ''سہو وسراغ'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کی یہ دراصل ان کے حاصل مطالعہ نوٹس ہیں ان کو کسی بھی کتاب میں کہیں کوئی قابل اصلاح یا قابل اضافہ بات نظر آئی اس پر حاشیہ لکھ دیا ان حواشی کو صابر دت نے ایک ترتیب دے کر شائع کرا دیا ہے۔ اردو میں اس طرح کی ایک روایت قاضی اطہر مبارک پوری کے یہاں بھی ملتی ہے ان کے علاوہ غالباً کوئی بھی ان کی اس اولیت میں ان کا شریک نہیں ہے۔

کالی داس گپتا کی تحقیقی حیثیت مسلم ہے لیکن تحقیق میں بھی ان کا اصل امتیاز اور ان کی اصل شناخت غالبیات ہے۔ کالی داس کا نام جب بھی لیا جائے گا تو پس منظر میں ہمیشہ غالب کی تصویر ابھرتی ہے، غالبیات پر انھوں نے ۱۹ کتابیں لکھیں اور ایک کتاب میں ایک مفصل باب لکھا اس طرح ان کے تحریری سرمایہ کا بڑا حصہ غالب شناسی کے لیے مختص ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑا تنوع بھی ہے انھوں نے غالب کی شاعری، عہد غالب، غالب کے تلامذہ، غالب کی تصانیف اور غالب کی شخصیت ہر پہلو پر لکھا ہے، غالبیات پر ان کی کتابوں کی فہرست شمیم طارق کے مطابق درج ذیل ہے۔

۱۔ دعائے صباح

۲۔ متعلقات غالب

۳۔ انتخاب آتش و غالب

۴۔ غالبیات، چند عنوانات

۵۔ دیوان غالب عکسی ۱۸۴۱ طبع اول

۶۔ دیوان غالب عکسی ۱۸۶۲

۷۔ آب حیات میں ترجمہ غالب

۸۔ دیوان غالب کامل تاریخی ترتیب سے

۹۔ غالبیات چند شخصی اور غیر شخصی حوالے

۱۰۔ غالب درون خانہ

۱۱۔ پنج آہنگ میں مکاتیب غالب

۱۲۔ غالب کی بعض تصنیفات کے بارے میں

۱۳۔ دیوان غالب متداول تاریخی ترتیب سے

۱۴۔ اسداللہ خان غالب مرد

۱۵۔ غالب کا ایک مشاق شاگرد، بالمکند بے صبر

۱۶۔ انتخاب رقعات و اشعار غالب

۱۷۔ غالبیات کچھ مطالعے اور مشاہدے

۱۸۔ غالب (مختصر حالات اور انتخاب کلام مع شرح)

۱۹۔ تفہیم غالب کے دو حرف (اور دوسرے مضامین)

مذکورہ بالا فہرست جناب شمیم طارق نے اپنی کتاب ''کالی داس گپتا رضا'' میں ص ۴۰۔ ۸۲ تک دی ہے، اس فہرست کی خاص بات ہی ہے کہ یہ تاریخی ترتیب سے ہے اس کے مطابق غالب پر ان کی پہلی کتاب دعائے صباح ہے جو ۱۹۷۷ میں شائع ہوئی اور آخری کتاب تفہیم غالب کے دو حرف ہیں جو ۱۹۹۹ میں شائع ہوئی ؎2

کالی داس گپتا کی غالب پر ابتدائی کتابوں میں ایک اہم کتاب متعلقات غالب ہے، اپنے مشمولات کے اعتبار سے یہ سہو و سراغ کے قبیل کی کتاب ہے اس کی اشاعت سے ان کی تحقیقی حیثیت مسلم ہوگئی، ظفر ادیب نے ۱۹۸۲ میں ان پر تحقیقی کام کیا تھا جو غالبیات سے متعلق اصلاً اسی

کتاب پر منحصر تھا اس کے علاوہ دو کتابیں اور بھی تھیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی تھی اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے گیان چند نے لکھا ہے۔

> ''یہ مضامین عام دل چسپی کے نہیں ہیں، یہ کلام غالب کے رسیاؤں کے ڈھب کے بھی نہیں ہیں۔ یہ صرف محققین غالب کے درخور التفات ہوسکتے ہیں ان مضامین میں رضا صاحب نے بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا ہے، بہت سے حقائق کو پہلی بار افشاء کیا ہے'' 3

کالی داس گپتا کی غالبیات پر ۱۹ کتابیں ہیں اگر ایک جملے میں ان پر تبصرہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے وہ تمام تحریریں ایسا جھروکہ ہیں جن سے غالب کی شخصیت کے بارے میں ایسی گہری اور نہایت جزوی اور مخصوص معلومات حاصل ہوتی ہیں گویا مصنف تاریخ کے پردے چاک کر کے عہد غالب میں دیکھ رہا ہو، غالب درون خانہ ان کی ایسی کتاب ہے لگتا ہے مصنف نے غالب کے مکان میں بالا خانے پر بیٹھ کر لکھی ہے اس میں سب تو نہیں لیکن ان کے گھر سے متعلق سب سے زیادہ تفصیلی معلومات درج ہوگئی ہیں۔

غالباً اس لیے گیان چند جین نے لکھا ہے:

> ''غالب کی خاندانی اور گھریلو زندگی کے بارے میں جو بھی معلومات بہم پہنچ سکتی تھیں وہ سب اس کتاب میں یکجا کردی گئیں ہیں'' 4

کالی داس گپتا کی ان کتابوں کا لفظ لفظ قیمتی ہے یہ کتابیں باضابطہ تصنیف سے زیادہ ان کی تحقیقات اور ان کے حواشی کا مجموعہ محسوس ہوتی ہیں۔ ان سے اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن ان میں زائد اور غیر ضروری مواد تلاش کرنا تقریباً مشکل ہے۔ ان کی تمام کتابوں میں ان کے مخصوص ذوق یعنی سہو وسراغ کے ساتھ ساتھ جو کوشش سب سے نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے غالب کے معاصر حوالے بڑی تعداد میں جمع کر دیے، غالب کے خطوط کے علاوہ ان کے عہد کے تذکرے، اخبارات، سفرنامے، روزنامچے، شعروشاعری وغیرہ میں جو کچھ بھی غالب کے بارے میں لکھا گیا تھا اس کو مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔

خیال رہے کہ ان کی تصنیفات میں تکرار کا عنصر ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے تصنیفی ترتیب سے یہ کتابیں نہیں لکھیں تھیں، بلکہ اپنی تحقیقات اور دریافتوں کو یکجا کیا تھا اور ایسا ہوتا

ہے کہ بعد کی تصنیفات میں سابقہ تصنیفات کے مضامین شامل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے انھوں نے اپنے بعض مضامین کو ایک سے زائد کتابوں میں شامل کیا ہے۔

جناب شمیم طارق نے ان کی غالب شناسی کا ذکر کرتے ہوئے اچھا تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''یہاں مختصراً یہ بتانا مقصود ہے کہ انھوں نے غالب اور غالبیات پر جو کام کیے ہیں، ان میں زیادہ توجہ غالب کے ذاتی اور سماجی احوال کی تحقیق، ان کی کتابوں، شاگردوں اور شعروں کی بازیافت، غالب اور غالبیات سے متعلق مشہور مفروضوں پر نقد و جرح اور ماہرین غالبیات کی کتابوں میں در آنے والی غلطیوں کی نشاندہی اور اخذ کیے ہوئے نتائج کی جانچ پڑتال پر دی گئی ہے'' 5

کالی داس گپتا کی غالب شناسی پر یہ انتہائی جامع اور مبنی بر حقیقت تبصرہ ہے ان کی تمام تصنیفات میں ان کا یہ اسلوب نگارش نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ کہ ان کی تصنیفات میں اتنا مواد ہے کہ یہ انیس کتابیں اگر باضابطہ تصنیف ہوتیں تو کم از کم دوگنی تو ضرور ہوتیں۔

غالبیات کے سلسلے میں ان کا ایک پائیدار کام وہ ہے جو انھوں نے غالب کے دیوان پر کیا ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اس کام کی خصوصی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ان کا ایک بڑا کارنامہ دیوان غالب کامل کی ترتیب و تدوین ہے جس میں انھوں نے غالب کے اردو کلام کو بہ لحاظ زمانہ ترتیب دیا ہے'' 6

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس کے متعلق لکھا ہے:

''کالی داس گپتا رضا کے تحقیقی کاموں میں غالب کے اردو دیوان کی تحفیظ و ترتیب سے متعلق ان کا کام بالخصوص بہت سر کشیدہ ہے'' 7

مزید لکھا ہے

''رضا صاحب نے دیوان کو ترتیب دینے میں بڑی دقت نظری اور محنت سے کام لیا ہے اور گیارہ ادوار میں غالب کے کل دستیاب اور یافت شدہ

اردو کلام کو زمانی اور تاریخی ترتیب سے درج اور مرتب کیا ہے، یعنی خود ان
کے بقول سب سے پہلے وہ اشارے دیے گئے ہیں جو سب سے پہلے
تخلیق ہوئے، اس کے بعد تحقیقات مابعد، اس روش سے کلام غالب کی
ترتیب، غالب کے ذہنی اور فنی ارتقا میں بڑی مدد دیتی ہے، یہ علمی کام
غالبیات میں رضا صاحب کے لیے حیات جاوداں کا ضامن اور نقیب
ہے"[8]

مالک رام، گیان چند جین اور دوسرے محققین نے بھی اس اشاعت کے بارے میں ایسے ہی کلمات کہے ہیں، اور اس کی مقبولیت دیکھیے کہ خود مصنف کی حیات میں اس کے چار ایڈیشن نکل گئے اور ہر ایڈیشن میں کچھ اضافے اور تصحیحات ہوتی رہیں، انھوں نے اس کی ترتیب کے لیے ۱۹ مراجع پر انحصار کیا جو زیادہ تر عہد غالب کے ہیں، اس دیوان کی ترتیب سے نہ صرف غالب کے شعری ذوق کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے اس کے ذریعے بہت سی ان غلط فہمیوں کی اصلاح ہو جاتی ہے جو غالب کے بعض اسفار کی بنیاد پر ان کے سوانح نگاروں کو ہوئیں تھیں۔

کالی داس گپتا رضا کی غالب شناسی واقعتاً ایک وسیع موضوع ہے انھوں نے بعض غالب شناسوں کا محاکمہ کیا ہے لیکن خود ان کا محاکمہ اور ان کی اولیات کو درج فہرست کرنے کی ضرورت ہے، انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ غالب شناسی کے دشت کی سیاحی میں گذارا اور نہایت قیمتی لعل و جواہر اکٹھا کیے، اوپر مذکور دیوان کے علاوہ اسد اللہ خاں غالب مرد، متعلقات غالب، غالبیات۔ چند شخصی حوالے، غالب درون خانہ، غالبیات کچھ مطالعے اور مشاہدے وغیرہ ان کے ایسے اہم تحقیقی کارنامے ہیں جن کے تذکرے کے بغیر غالب شناسی کی تاریخ بھی ادھوری ہے اور ان کو صرف نظر کر کے حیات غالب اور عہد غالب پر جو کام بھی ہوگا اس میں ان کی کمی محسوس ہوگی۔

○

حواشی:

1۔ ماہنامہ معارف، مئی ۲۰۰۱، جلد ۱۶۷، شمارہ ۵، ص ۳۸۹۔۳۹۰

2۔ شمیم طارق، کالی داس گپتا رضا، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، ۲۰۰۴، ص ۴۰۔۸۲

3۔کالی داس گپتا رضا، متعلقات غالب، ونل پبلی کیشنز ممبئی ۱۹۷۸، مقدمہ از پروفیسر گیان چند جین، ص ۱۱

4۔سہ ماہی اسباق، پونہ، مرتب نذیر فتح پوری، جولائی ۲۰۰۱، ص ۷۸

5۔کالی داس گپتا رضا، محولہ بالا، ص ۴۰۔۴۱

6۔معارف، محولہ بالا، ص ۳۹۰

7۔سہ ماہی اسباق، محولہ بالا، ص ۸۳

8۔ایضاً، ص ۸۵

اخلاق احمد آہن

عہد غالب کے فارسی اخبارات اور غالب

غالب کا عہد کئی اعتبار سے تبدیلیوں اور انقلابات کا عہد ہے۔ ان میں سیاسی، سماجی، فکری، ثقافتی، ادبی اور تکوینی تبدیلیاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہندوستان عہد وسطیٰ کی تہذیبی قدروں سے نکل کر عہد جدید کی قدروں سے روشناس ہو رہا تھا، جس کی جڑیں مغرب اور مغربی استعماری نظام سے بھی پیوست تھیں۔ غالب اپنی زندگی میں جن مادی مسائل سے دوچار ہوئے مثلاً جائداد اور پنشن کا مسئلہ اور اس کے نتیجہ میں دربار شاہی اور انگریز بہادر کے یہاں حاضری، سفر کلکتہ وغیرہ نے لازمی طور پر انھیں ان تبدیلیوں سے آگاہ اور متاثر کیا۔ وہ اپنے ان چندے معدودے معاصرین میں سے تھے، جنھوں نے ان تبدیلیوں کی آہٹ سنی؛ البتہ ان مختلف شخصیات کا ردعمل گونا گوں تھا۔ اگر چہ یہ آج ناچیز کے بحث کا موضوع نہیں، لیکن اجمالاً عرض کرتا چلوں کہ اس 'تہذیبی ردعمل' کی بنیاد پر ان شخصیات کے فکری رویہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً سرسید نے تہذیبی وراثت کے تحفظ کو ایک تحریک کی شکل دی اور اس کے دائرہ میں تعلیم، مذہبی مباحث، زبان و ادب کو خاص طور سے پیش نظر رکھا اور اپنے ہم خیال دانشوروں کی ایک ٹیم تیار کی۔ آثار الصنادید کی تصنیف، تاریخی کتابوں کی تدوین، زبان و ادب کے تعلق سے نئے نظریات اور اسلوب کی بازیافت اور اس کی کامیاب تبلیغ و تشریح، تہذیب الاخلاق کی اشاعت اور آخر کار محمڈن اورینٹل کالج کا قیام اس فکر اور تحریک کا نتیجہ ہے، اور برصغیر میں جدید مشرقی تعلیم و ثقافت کی بنیادیں کسی نہ

کسی شکل میں اس تحریک سے وابستہ ہیں۔ اگرچہ غالب، سرسید، راجہ رام موہن رائے، سید احمد شہید وغیرہ کی طرح مصلحانہ یا رہنمایانہ رول ادا کرنے کے متحمل نہیں، لیکن اپنی بیدار مغزی اور ذہانت کی بنا پر وہ ان تبدیلیوں سے بے خبر نہ تھے اور اس کی طرف ان کے خطوط میں اشارے ملتے ہیں۔

انھیں تبدیلیوں میں ایک اہم پیشرفت صحافت کی ابتدا تھی۔ ہندوستانی زبانوں میں ۱۹ویں صدی کی دوسری دہائی میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ فارسی، اردو اور ہندی میں بھی صحافت کا آغاز ہوا۔ ابتدائی دنوں میں یہ اخبارات کلکتے سے شائع ہوئے اور شمالی ہند اور دہلی میں تقریباً بیس سال بعد ان کی اشاعت شروع ہوئی۔ البتہ شمالی ہندوستان کے متعدد افراد اس نئی پیشرفت سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ وابستہ بھی تھے۔ اگرچہ عہد غالب میں شائع ہونے والے مطبوعہ اخبارات کی تعداد تیس سے زیادہ ہے، لیکن یہاں انھیں اخبارات کا ذکر کیا جائے گا، جن سے ان کی راست یا بالواسطہ وابستگی کے ثبوت فراہم ہو سکے ہیں۔ انھیں ابتدائی اخبارات میں ایک اخبار ''سی رام پور'' ۷/اپریل ۱۸۲۶ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ کچھ مسیحی مبلغوں نے ایک بڑا تبلیغی مرکز سی رام پور میں قائم کیا اور اس کے ساتھ ہی ''سی رام پور کالج'' بھی قائم کر دیا جس کا اعلانیہ مقصد اپنے پیغمبر کے ''آسمانی الہام کے نور کو ہندوستان میں ممکن العمل وسعت تک پھیلانا تھا۔''(۱) یہ وہی مسیحی مبلغ تھے جنھوں نے اس سے قبل انگریزی اور بنگالی زبان کا مشترکہ رسالہ ''ڈگ درشن'' کے نام سے اپریل ۱۸۱۸ء میں شائع کیا تھا، جو دیسی زبان کا پہلا رسالہ تھا۔ اس کے روح رواں رام پور کے تثلیث کے ممتاز شخص ڈاکٹر جوشا مارش مین تھے۔(۲) اس کے بعد مئی ۱۸۱۸ء میں انگریزی رسالہ ''فرینڈ آف انڈیا'' شائع کرنا شروع کیا۔(۳)

اخبار سی رام پور کی اشاعت سے پہلے مارش مین (Marshman) نے حکومت کے چیف سکریٹری کی وساطت سے ایک درخواست لارڈ امہرسٹ کی خدمت میں پیش کی، جس میں فارسی زبان میں اخبار کی اشاعت کی اہمیت اور فوائد کے ذکر کے ساتھ ساتھ مالی امداد کی بھی درخواست کی گئی تھی۔(۴) چنانچہ چیف سکریٹری نے لارڈ امہرسٹ کی ہدایت کے مطابق شعبۂ فارسی کے سکریٹری مسٹر اسٹرلنگ کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے یہ درخواست ان کے پاس بھیج دی۔ مسٹر اسٹرلنگ بڑے ادب پرور شخص تھے اور انھیں فارسی زبان سے خاص لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے مرزا غالب سے بھی ان کے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ چنانچہ مرزا غالب نے اپنے مقدمے کی

پیروی کے سلسلے میں جب کلکتہ کا سفر کیا تو اسٹرلنگ کا برتاؤ ان کے ساتھ بڑا ہمدردانہ رہا اور ان سے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کیا لیکن بدقسمتی سے وہ جلد ہی دارِفانی سے کوچ کر گئے۔(۵) مرزا غالب نے اس واقعہ پر خود کو کوستے ہوئے "طالع مربی کش" کہا کہ ان کی ملاقات کے سبب مسٹر اسٹرلنگ بمرگ ناگہاں مر گئے۔ مسٹر اسٹرلنگ نے اپنی فارسی نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے اخبار سی رام پور کے اجراء کی خاطر مارش مین کی درخواست پر ہمدردانہ طور پر غور کیا اور ۷/اپریل ۱۸۲۶ء کو کچھ شرائط کے ساتھ اخبار شائع کرنے کی اجازت دے دی اور انھیں لکھا:

> "آپ کے بنگلہ اخبار کا فارسی ترجمہ شائع کرنے کی تجویز کے متعلق مجھ کو ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو مطلع کروں گا کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے طے کیا ہے کہ آپ کے اخبار کو ۱۶۰ روپے ماہوار کی امداد دی جائے اور اس کے معاوضے میں گورنمنٹ کو آپ کے اخبار کی، جس وقت سے وہ شائع ہو، ۱۶۰ کاپیاں ملا کریں گی۔
>
> گورنر جنرل باجلاس کونسل آپ کے اس وعدہ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ آپ کا اخبار تمام قابل اعتراض باتوں کی اشاعت سے احتراز برتے گا۔ ساتھ ہی انھیں اس کا بھی یقین ہے کہ آپ اپنے اخبار کو دیسی لوگوں کے لیے انداز بیان کے لحاظ سے قابلِ قبول اور خبروں کے لحاظ سے مفید بنانے میں کمی نہیں کریں گے۔"(۶)

اس اجازت نامہ کے ساتھ یہ طے پایا کہ اس ہفت روزہ اخبار کے شمارے سرکاری اداروں کے افسران کے علاوہ دہلی، آگرہ اور بنارس کے کالجوں نیز کلکتہ کے دو تعلیمی اداروں ہندو کالج اور مدرسہ میں ہر ایک کو چھ چھ شمارے بھیجے جائیں گے۔ چنانچہ ان افسران اور اداروں کی ایک فہرست بھی اجازت نامہ کے ساتھ بھیج دی گئی۔(۷) سمر جیت چکر برتی کے مطابق یہ ۶ مئی ۱۸۲۶ء کو شائع ہونا شروع ہوا(۸) جو مذکورہ بیان سے غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ ہفت روزہ "سی رام پور" مئی ۱۸۲۸ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عام طور سے بنگالی اخبار سمار چار درپن میں شائع شدہ خبروں وغیرہ کا ترجمہ چھاپا جاتا تھا۔ مئی ۱۸۲۸ء کے بعد مدیر نے سرکاری امداد بند ہو جانے کے سبب اس کی اشاعت بند کر دی۔ برطانوی حکومت نے بظاہر مالی دشواریوں کے سبب "سی رام پور" بنگلہ اور فارسی اخبارات کی امداد روک دی تھی البتہ سی رام پور

والوں نے اپنے بنگلہ زبان کے اخبار "سماچار درپن" کو جاری رکھا۔(۹)

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ یہ اخبارات مسیحیت کے مبلغین کی ایک جماعت شائع کرتی تھی، اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ وہاں بنگلہ زبان کو سمجھنے اور پڑھنے والے زیادہ تھے اور اس زبان کے توسط سے عام لوگوں تک رسائی بھی آسان تھی، اس لیے مالی دشواریوں کے باوجود ان لوگوں نے بنگلہ اخبار جاری رکھا۔

اخبار سی رام پور کے بند ہونے کا واقعہ لارڈ امہرسٹ (Lord Baron Amherst) کی گورنر جنرل شپ کے آخری دور میں پیش آیا۔ بعد میں جب لارڈ ولیم بنٹنک جولائی ۱۸۲۸ء میں گورنر جنرل بن کر آئے تو مارش مین نے ان سے دوبارہ اخبار سی رام پور جاری کرنے کے لیے درخواست کی اور وہ اس کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے۔ مارش مین کی کوشش یہ بھی تھی کہ اگر گورنر جنرل کم از کم ڈاک محصول بھی معاف کر دیں تو بھی اخبار کو جاری کر دیں گے۔ لیکن لارڈ بنٹنک نے اپنے پیشرو کے فیصلے کو اس عذر کے ساتھ برقرار رکھا کہ جن مالی دشواریوں کے باعث اخبار کی امداد موقوف کی گئی تھی، وہ اب بھی بدستور قائم ہے۔ یہاں ایک بات قابل توجہ ہے اور وہ کہ برطانوی حکمران اور ہندوستان میں ان کے ایجنٹ تجارت اور سیاست کے ساتھ تبلیغ مسیحیت کی حمایت اور سرپرستی کرتے تھے، اور خاص طور ولیم بنٹنک اس ایجنڈے کو بڑھانے میں پیش پیش تھے، بقول مارگریٹا پرنو:

> "The Governor Generalship of William Bentinck is commonly regarded as paving the way for the victory of the Anglicists over the Orientalists. (the disscussion was that) were the British to secure their dominion by cultural adaptaion, ruling according to what they perceived as the traditions of oriental monarchy, acting as patrons for classical scholarship and religion, otherwise content to

> siphon off the profit from trade and land revenue? Or should they, on the contrary, base their government on the principles of Utilitarianism and Christian faith, introducing social reforms wherever it could be done without provoking a revolt, spreading, if not the English language, then at least English knowledge through the medium of the vernacular, hoping thus to pave the way for the ultimate triumph of Christianity?"(10)

تو پھر یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ انگریزی حکومت نے ایک خالص تبلیغی اخبار کی اعانت سے کیوں ہاتھ روک لیا۔ اس وقت کے تاریخی صورتحال کے پیش نظر ذہن میں دو باتیں آتی ہیں۔ اول تو یہ کہ ہندوستان میں انگریزوں نے اگرچہ مقامی زبانوں میں اخبارات کی اشاعت کی اجازت تو دے دی تھی، لیکن ان کے یہاں ایک مضبوط رائے ان اخبارات کی پابندی کے حق میں تھی، کیوں کہ وہ کسی بھی صورت میں عوامی بیداری کے خلاف تھے؛ دوم یہ کہ ہندوستان میں جن طبقات اور گوشوں کو انگریزی حکومت اور مغربی استعماری دانشوری چیلنج تصور کرتی تھی، ان میں فارسی زبان اور فارسی داں طبقہ سب سے زیادہ اہم تھا، اور ظاہر ہے اس میں ہندوستان کا تقریباً تمام تعلیم یافتہ اور دانشور طبقہ یا ہندوستانی اشرافیہ شامل تھا اور ان میں تمام مذاہب اور خطوں کے لوگ تھے۔ یہاں کیتھرین پرایور کی رائے قابل توجہ ہے۔ لکھتی ہیں:

> "What was at stake was the replacement of the British association with and rule through the old feudal elites by an alliance with those who saw the possibility of social ascendancy through service in the colonial administration and acquisition of

British knowledge"(11)

مارگریٹ پرنواس پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر لکھتی ہیں کہ:

"This emphasis on a genuine indigenous interest in the Anglicist project does not deny the link between colonial construction of knowledge and the exercise of colonial power."(12)

اس سلسلے کا دوسرا اخبار ہفتہ وار ''آئینہ سکندر'' تھا جو بمقام کلبہ موجودہ کلنس اسٹریٹ (کلکتہ) سے شائع ہوتا تھا۔(۱۳) فارسی زبان کی ترویج واشاعت اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے ''آئینہ سکندر'' کو بڑی امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ اس اخبار کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت تھی جس کی نظیر شاید ہی صحافتی تاریخ میں کہیں ملے اور وہ یہ تھی کہ ہر خبر کے عنوان کے ساتھ اس خبر کی نوعیت کے لحاظ سے ایک شعر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ اگر چہ یہ روش ابتدائی دو سالوں میں دکھائی نہیں دیتی ہے لیکن ۲۶راگست ۱۸۳۳ء (شمارہ ۱۳۰) سے خبروں کے ساتھ اشعار شامل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب یہ آئینہ سکندر میں پہلی بار چھپے تو اس کے ساتھ ہی صحافت میں اس ادبی بدعت کی ابتدا ہوئی۔ اس اخبار کے پہلے صفحہ پر نام کی مناسبت سے ہی حافظ کا مشہور شعر چھپا ہوا ملتا ہے:

آئینہ سکندر جام جم است بنگر
تا بر تو عرض دارد احوال ملک دارا

۲۶راگست ۱۸۳۳ء سے اس اخبار میں ایک بڑی دلچسپ تبدیلی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اس میں اکثر خبروں کی ابتدا میں خبر کی سرخی کے بعد اس خبر کی مناسبت سے ایک شعر چسپاں ملتا ہے۔ مثلاً اسی دن کی یہ خبریں:

عنوان : خبر دربار خلافت آثار شاہ عالم پناہ دہلی

شعر :

زحال حضرت شاہ خلیفۃ الرحمٰن
تمام صفحۂ اخبار گشت نور افشان

عنوان : خبر کلکتہ
شعر :

خفا کن پرورشہا تا بدانی
کہ طبیعت زاد اطفال معانی

عنوان : خبر دربار صولت انار مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر والی لاہور
شعر :

حکایتِ نمکین و ذکر کلام ملیح
درین جریدۂ اخبار یافتہ توضیح

عنوان : خبر نصیر آباد و مدراس و جزو ترہت
شعر :

بافراط و تفریطِ این آسمان
چشیدم تر و خشک دورِ جہان

اسی طرح ۴ر جنوری ۱۸۳۶ء کے شمارہ میں شامل کچھ خبروں کے عنوان اور ان کے ساتھ شامل اشعار کو قارئین کی دلچسپی کی خاطر نقل کیا جاتا ہے۔

عنوان : خبر دار الخلافہ روم
شعر :

آسمان حشمت و خورشید جاہ
حامی شرع نبی ظل الہ

عنوان : خبر والی ٹونک
شعر :

این امیر عاقل و تقوا شعار
است بازل ہم شجاع و ذی وقار

عنوان : خبر خاقان ایران
شعر :

بر آسمان حشم مہر و مہ بر اوج کرم
خلیفہ احدی مالک رقاب امم

عنوان : خبر کونسل
شعر :

قیمت یک بوسہ اش ایمان و جان است
نیک این سوداگری اندر جہان است

۲۵ر نومبر ۱۸۴۳ء کے شمارے میں ایک بڑا خوبصورت قطعہ درج ہے، جو حیدر آباد میں ایک مجلس اور وہاں واقع ہوئے ناشائستہ واقعات پر اظہار افسوس کے طور پر کہا گیا تھا لیکن آج کے حالات پر زیادہ صادق آتا ہے:

کم شد درین زمانہ ز عالم نشان علم
شد وقف سیل جہل ہمہ خانمان علم
ای چرخ خون ببار کہ قاضی شہر ما
غیر از زبان تیغ نسازد بیان علم

اسی طرح دوسری خبروں کے ساتھ بھی اشعار درج ہیں اور اخبار کے آخر میں ایک خوب صورت سا قطعہ لکھا ہوا ہے:

با دلِ صاف مظہر انوار — شبہ آئینہ را بود مشہور
ماہ در اصل جوہر است سیاہ — کند از شمس اقتباس نور (۱۴)

اس اچانک تبدیلی سے ایسا لگتا ہے کہ یا تو ادارت میں اتنی بڑی تبدیلی عمداً لائی گئی ہے یا ایڈیٹر بدل گیا ہے۔ ویسے اس اخبار کی زبان شروع سے ہی بڑی ادیبانہ اور بلیغ رہی ہے۔

عتیق احمد صدیقی کی رائے یہ ہے کہ ان میں اکثر اشعار ایڈیٹر کی کاوش طبع کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی سراج الدین اس اخبار سے وابستہ تھے، کیوں کہ اردو و فارسی کے معروف زمانہ شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کا مولوی سراج الدین کے نام تحریر کردہ خط اس اخبار میں شائع ہوا تھا، جس کا اقتباس یوں ہے:

"صاحب من دیدہ بمشاہدہ" آئینہ سکندر" فروعالی گردید وصفائی عبارتش، گہر برشتہ نظارو کشید بیانہائے خوش وخبرہائے مختصر ونکتہ ہائے دل پسندورقم ہائے نظر فریب دارد..... امروز یک شنبہ چارم ستمبراست نامہ نامی باوراق اخبار بمن رسیدہ است، مبارزالدولہ حسام الدین حیدرخان بہادر وفخر الدولہ نواب امین الدین احمد خان بہادر دیدند وخریداری این رانہ پسندیدہ زین پس ہر کہ از اعیان دیار ہرچہ برمن خواہد فرمود بشما عرض خواہم کردو۔ والسلام"(۱۵)

اس خط سے یہ حقیقت بھی مترشح ہے کہ مولوی سراج الدین نے آئینہ سکندری کے خریداروں کی تعداد بڑھانے کے لیے مرزا غالبؔ سے سفارش کی تھی جس کے جواب میں مرزا صاحب نے لکھا ہے۔ محمد عتیق صدیقی نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی سراج الدین صاحب ہی آئینہ سکندر کے ایڈیٹر تھے۔(۱۶) غالبؔ کے مذکورہ خط سے موصوف کا بیان درست اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اس اخبار میں مرزا غالبؔ کی فارسی غزلیں اور اشعار بھی شائع ہوا کرتے تھے، جس سے اس کی اہمیت کا پتہ ملتا ہے، کیوں کہ مولوی سراج الدین سے دوستانہ روابط کے علاوہ غالب جیسے زبان شناس اور حساس شخص کا اپنے اشعار کو کسی اخبار میں چھپوانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ ضرور اس اخبار کی زبان اور اس کے ادبی معیار سے مطمئن رہا ہوگا، جس کا برملا اظہار بھی موصوف نے کیا ہے۔ اس اخبار میں مستعمل زبان کی شیرینیت اور اس کے ادبی معیار پر روشنی ڈالتے ہوئے "لدھیانہ اخبار" (۱۴ر مارچ ۱۸۴۰ء) لکھتا ہے کہ:

"برطالبان اخبار واضح باد کہ قبل ازین اخبار آئینۂ سکندری در چھاپہ لدھیانہ نرسیدہ۔ اکثر اوقات از تحریر منشی واجد علی صاحب مہتمم اخبار آگرہ شیریں کلامی اخبار آئینہ سکندری دریافت می شد۔ درین وقت کہ راقم اخبار سکندری یک قطعہ خود بہ چھاپہ خانہ لودیانہ ارسال فرمودند حتی کہ از مضمونش جان و دل حلاوت تازہ گرفت۔ لیکن چند ابیات بوستان کہ در اخبار خود درج فرمودند، آن ابیات در بوستان وشرح آن یافتہ نمی شود۔ شاید کہ سعدی دیگر در شیراز پیدا شدہ باشد۔ اکثر اہل شیراز مقیم لودیانہ برین

ابیات گواہی نمی دہند......"

آئینہ سکندر میں بھی دوسرے اخبارات کی طرح زیادہ توجہ عام خبروں پر ہی دی جاتی تھی۔ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ مروجہ طرز کو ہی اپنائے ہوئے تھا اور ہم عصر اخباروں سے مختلف نہیں تھا۔ اس اخبار کے آخر میں شائع ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اپنا چھاپہ خانہ "مطبع آئینہ سکندر" کے نام سے تھا:

> "بمقام کلنبہ، متعلقہ کلکتہ، بحویلی نمبر ۱۵۷، بچھاپہ خانہ آئینہ سکندر مطبوع گشت"(۱۷)

اس مطبع سے اخبار کے علاوہ کتابوں کی اشاعت کا سراغ بھی ملتا ہے۔ چنانچہ جو کتابیں مطبع آئینہ سکندر سے شائع ہوتی تھیں، اس سے متعلق اشتہارات بھی گاہے بگاہے اس میں دکھائی دے جاتے ہیں مثلاً ۱۴ر نومبر ۱۸۳۶ء کے شمارہ میں "رباعیات خیام" کا اشتہار چھپا ہوا ہے۔ اس کے ابتدا میں یہ شعر درج ہے:

> ہر کہ او ذوق سخن دارد بجان
> خدمتش این نسخہ باشد ارمغان

اشتہار میں اگر چہ مرتب کا نام درج نہیں، لیکن لہجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدمت مولوی سراج الدین صاحب نے ہی انجام دی ہوگی۔(۱۸) مرتب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی تذکروں اور بیاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "بہ تصحیح آن، جہد بلیغ بہ کار بردہ در مطبع آئینہ سکندر طبع ساختم۔ ہر کرا اشتراک منظور باشد از مطبع مصدر الذکر طلب فرمایند۔"

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ عام خیال ہے کہ رباعیات خیام کی مقبولیت ہندوستان میں بھی فٹجر الڈ کے ترجمے کے بعد ہوئی ہے، اس اشتہار سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ بہار سے شائع ہونے والے غالباً پہلے فارسی اخبار "اخبار الکبیر" کے اجرا کا اشتہار بھی آئینہ سکندر کے ۲۰ر جون ۱۸۳۶ء کے شمارہ میں "بنائے مطبع جدید" کے عنوان سے ملتا ہے۔ جو اس طرح تھا:

> "از آنجا کہ در ضلع بہار مطبع نیست..... میر کبیر حسن سا میر حاضر باش کونسل از طرف مہاراجہ جیت سنگھ بہادر..... چھاپہ خانہ مسمی بمطبع کبیری در قصبہ گیاجی کہ بصاحب گنج ہم معروف است احداث می

کند....کاغذالکبیراست۔‘‘(۱۹)

آئینہ سکندر کے علاوہ ہفت روزہ شمس الاخبار جو متھرا موہن مترا کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، اس میں بھی نثر کے علاوہ نظم کی صورت میں خبریں چھپتی تھیں۔ مثلاً انیس اشعار پر مشتمل ایک خبر جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

’’خواندہ ام در کاغذ اخبار حالی بس غریب‘‘

اور واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ:

بود طفلی سیزدہ سالہ بانگلند اندرون
صاحب نطق و فصیح و طالب علم فنون
در شبی خوابیدہ بر بستر چو شبہائی دیگر
صبح دم برداشت سراز خواب چون آن گلبدن
یافت خود را گنگ ساں بی نطق و عاجز در سخن

اس لڑکے کے رشتہ داروں نے بہت دوڑ بھاگ کی اور طبیبوں نے بھی اپنے طور پر کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا:

لیک سعی چارہ جویاں را اثر ظاہر نشد
زان کہ اصلاً ہیچ کس بر علتش ماہر نشد

لیکن کچھ دنوں کے بعد بفضل کردگار

گشت گویا باز آن کودک بیک دم چون ہزار

اور اس تعجب خیز اتفاق کو تفصیل سے منظوم کیا گیا ہے(۲۰)

سراج الاخبار

یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا جو ۱۸۴۱ء میں دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے ایڈیٹر سید اولاد علی تھے۔ یہ مطبع سلطانی میں مصلح الدوّلہ سید ابوالقاسم کے زیر اہتمام چھپتا تھا۔(۲۱) مغلیہ بادشاہوں کی درباری روایت کے مطابق ہر بادشاہ کا ایک وقائع نویس ہوا کرتا تھا۔ مصلح الدولہ سید ابوالقاسم، بہادر شاہ ظفر کے وقائع نویس اور سلطنت مغلیہ کے آخری وقائع نویس تھے۔(۲۲) غالباً اسی مناسبت سے مشہور مستشرق گارسیں دتاسی (Garsin Da Tassi) نے سراج الاخبار کو دہلی کا ’’سب سے پرانا اخبار‘‘ کہا ہے۔(۲۳) جب سراج الاخبار چھپ جاتا تھا تو تایوق چی خان بادشاہ

کے پاس اخبار لے جاتا اور بادشاہ جس کو کہتے اس کو اخبار روانہ کر دیا جاتا تھا۔ خاص طور پر ہر ہفتہ معظم الدولہ کی معرفت لفٹنٹ آگرہ کے پاس یہ اخبار بادشاہ بھیجتے تھے تا کہ وہ اندازہ لگائے کہ اخبار میں کس قسم کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ (۲۴) دہلی کے مجسٹریٹ جان لارنس نے سراج الاخبار پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے نوٹ بک میں ۴/اپریل ۱۸۴۱ء میں لکھا تھا کہ:

''بادشاہ کا اخبار ''سراج الاخبار'' شاہی محل سے شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار سے وابستہ سارے لوگ شاہی ملازم ہیں۔ یہ ہفتہ میں ایک بار اتوار کو شائع ہوتا ہے۔ ہر ہفتہ اس کی ۳۶ کاپیاں ہی شائع ہوتی ہیں۔ زیادہ تر کاپیاں بادشاہ کے ہم نواؤں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ گورنر جنرل، لفٹنٹ گورنر اور محل کے گارڈ کمانڈر کو بھی ایک ایک کاپی بھیجی جاتی ہے۔ جن حضرات کو یہ اخبار بھیجا جاتا ہے ان کی تنخواہ سے ایک روپیہ ماہانہ اس اخبار کے اخراجات کی تکمیل کی خاطر لے لیا جاتا ہے۔ اس اخبار کی زبان خالص لیکن رنگین فارسی ہے۔'' (۲۵)

سراج الاخبار ہشت ورقی اخبار تھا۔ موضوع اور مضمون کے اعتبار سے یہ دوسرے اخبارات سے اس معنی میں مختلف تھا کیونکہ یہ ''اخبار بارگاہ فلک اشتباہ فروغ خاندان عالی شان گورگانی چراغ دودمان بخدمت نشان صاحب قرانی حضرت ظل سجانی خلیفۃ الرحمٰن خلد اللہ تعالی ملکہ...'' (۲۶) تھا۔

مذکورہ جملہ سے ہی اس اخبار کی ابتدا ہوتی تھی یعنی سراج الاخبار خاندان گورگانی کے سراج آخرین بہادر شاہ ظفر کے دربار کا نقیب، روزنامچہ یا نیوز لیٹر تھا۔ اسی لئے اس میں بہادر شاہ ظفر اور ان کے امرا سے متعلق خبریں ہی شائع ہوتی تھیں۔ شروع کے پانچ صفحات یا اس سے کچھ زائد پر بادشاہ کی روزانہ کی کارگذاری، ان کے متعلقین اور درباریوں سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں اور بقیہ تین صفحات ملکی، غیر ملکی اور مقامی خبروں کے لئے وقف ہوتے تھے۔ مثلاً مندرجہ ذیل رپورٹ:

''آفتاب طلوع نہ نمودہ بود کہ گیہان خدیو در برآمدہ بیٹھک کلان رونق افزا بودہ پایہ اش افزودند۔ عضد الدولہ حکیم غلام نجف خان بہادر شرفیاب مجرہ گردیدہ استدراک حال خیریت اشتمال نمود۔ برزبان معجز بیان شکایت

فروانی بلغم لزج گزشت و بموسس الدولہ بہادر حکم شد کہ ہنگام مرور یک پاس
روز معہ کاغذ تقسیم تنخواہ عملہ احتشام بجبین سائی عتبہ سپہر رتبہ معتصم حبل المتین
سعادت شود....'' (۲۷)

یا بادشاہ کو جب لڑکا پیدا ہوا تو مرزا غالبؔ نے شاہزادہ کی پیدائش پر ایک قطعہ فارسی میں لکھ کر اسے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ خبر ۲۹/ ستمبر ۱۸۴۱ء کے اخبار میں اس طرح ہے:

''عرض داشت اسد اللہ خان غالبؔ تخلص کہ زائچہ طالع نونہال
حدیقہ اقبال را بہ نظم درآوردہ معرفت نوروز علی خاں فرستادہ۔ درآن
داد سخنوری دادہ بود بہ نظر کرامت اثر گذشت و مورد تحسین گشت۔''

سراج الاخبار کے ۲۸/ جون ۱۸۴۳ء کے شمارے میں چھپی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ انگریزی اخباروں کی خبروں کو بھی ترجمہ کروا کر سنا کرتے تھے۔ اگر کسی اخبار میں ان کے متعلق کوئی غلط خبر شائع کی جاتی تو اس کی تردید سراج الاخبار میں شائع کی جاتی تھی۔ مثلاً ''کلکتہ اسٹار'' میں ایک خبر غلط پروپیگنڈہ کے مقصد سے شائع کی گئی تا کہ بادشاہ کے خلاف ہندوؤں کے دلوں میں نفرت پیدا کی جائے۔ چنانچہ سراج الاخبار نے ۲۸/ جون ۱۸۴۳ء کے شمار میں کلکتہ اسٹار کی خبر''.... حضرت بادشاہ جم پایگاہ از استماع...(خبر) درخصوص آوردن دروازہ سومنات مسرت افروز شدہ.... کے بارے میں ایک اشتہار چھاپ کر اسے غلط بتایا اور ساتھ ہی مہتمم سراج الاخبار نے کلکتہ اسٹار کے مدیر کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھا کہ بادشاہ کو ''از استماع ہیچو لغویات تنفر فطری است'' اور ایسی خبروں کو چھاپنے سے کیا فائدہ جسے لوگ جھوٹ سمجھیں اور اس کا مضحکہ اڑائیں۔ (۲۸)

۲۴/ مئی ۱۸۵۶ء میں چھپی بین الاقوامی اہمیت کی حامل ایک خبر سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دوسرے ہندوستانی اخبارات کی طرح سراج الاخبار بھی ایسی خبروں کو جس میں کسی طرح سے بھی انگریزوں کی مخالفت نظر آتی تھی، اپنے اخبارات میں شائع کرتا تھا۔ چنانچہ روسی اور ایرانی حکومتیں جو انگریزوں کی مخالف تھیں، انہوں نے انگریزی حکومتوں اور ان کی حامی حکومتوں میں اپنے جاسوس و مخبر چھوڑ رکھے تھے۔ اس سے متعلق ایک خبر:

''قندھار: کارسپانڈنٹ صاحب دہلی گزٹ مقام مرقوم الصدر ۲۱ مارچ
کو لکھتا ہے کہ میں نے اپنے پچھلے خط میں حال پہنچے ایک فرنگی کا ہرات
سے اور بہ سبب اس کے اظہار کے اوس کا انگریز ہونا اور بہ سبب

دریافت اس حال کے تواضع و مدارات سے پیش آنا امیر کا اور اس کی
نسبت مشروحاً لکھنا تھا۔ انجام کار امیر کو ثابت ہو گیا کہ وہ انگریز نہیں
ہے۔ ہر چند اب تک اپنے تئیں انگریز ظاہر کرتا ہے۔ امیر نے بہ سبب
قیام کلکتہ کے جو چند باتیں انگریزی یاد کر لی ہیں۔ انہیں فرنگی مذکور سے
کام میں لایا مگر وہ ان کا جواب نہ دے سکا اس کا امیر پیدا ہونے شک
کے اس سے مستدعی لکھنے الف باتائی انگریزی کا ہوا۔ سو وہ بھی شخص
مذکور نہ لکھ سکا اور اسی باعث اس کا پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ
پندرہ برس کی عمر سے ایران بیابان خراسان میں رہا ہوں۔ اس لئے
مجھے مزاولت تحریر و تقریر زبان انگریزی کی نہیں رہی۔ ان عذرات سے
امیر کو یقین ہوا کہ شخص مذکور راہ فریب آیا ہے اور شاید روسیوں یا
ایرانیوں کا جاسوس ہے مگر وہ پھر بھی اپنا انگریز ہونا ثابت کرتا رہا حالانکہ
کوئی وجہ موجہ اپنے انگریز ہونے کی اس نے بیان نہ کی۔ بالجملہ امیر
دوست محمد خاں نے خیال کہ قیام شخص مذکور قندھار میں برائے فساد ہوگا
اور اس لئے اس نے بحوالہ چند سواروں کے اسے سرحدات بلوچستان
پر بھیج دیا اور کہتے ہیں وہاں بحکم امیر وہ مارا گیا۔ یہ فرنگی اپنا نام مندوس
صاحب بیان کرتا تھا۔"

درباری رپورٹ اور خبروں کے علاوہ بادشاہ کے نام عوام کے شکایت نامے اور درخواستیں بھی شائع ہوتی تھی۔ اگر چہ ملک کے انتظامی معاملات میں مغل بادشاہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا اور اس کا اقتدار لال قلعہ کی چہار دیواریوں میں محدود ہو کر رہ گیا تھا لیکن عوام میں اس کا اثر و رسوخ اب بھی باقی تھا۔ چنانچہ ایک شہری نے پولیس کی زیادتیوں سے تنگ آ کر بادشاہ کے حضور میں عرضی گذاری جو فروری ۱۸۵۲ء کے ایک شمارہ میں شائع ہوئی:

"...سواری مبارک در صحن دیوان خاص رسیدہ بود کہ انبوہ کثیر از رعایا شہر و
سکنائے صاحب باغ و دیگر املاک شاہی استغاثہ تعدی عملہ پولس در اخذ و
جود چوکیدار مجوزہ حال کہ دو چند و سہ چند از روئے تعداد نسبت معمول
سابق بودہ نمودند و عرض داشتند۔"

نیشنل آرکائیو آف انڈیا، دہلی میں ۱۲۵۷ھجری (۲۔۱۸۴۱ء) کے ۱۷ شمارے اور ۱۲۵۶ھجری (۱۸۴۱ء) کے ۲۶ شمارے بالترتیب Bundle-1 اور 2 کے عنوان سے محفوظ ہیں لیکن غلطی سے اسے ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۶ء درج کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اخبار دربار معلیٰ کے ۱۸۳۰ کے مارچ کے شمارے میں جائداد کے مقدمہ کے حوالے سے، اپریل میں کلکتہ جانے کا ذکر، مئی میں ان کے خلاف انگریزوں کے یہاں جھوٹی شکایت، ۲۰ مئی مقدمہ کے تعلق سے، جولائی میں قرض کے تعلق سے، ستمبر میں مقدمے کے دستاویزات کے تعلق سے خبریں مندرج ہیں۔

احسن الاخبار

بمبئی سے شائع ہونے والا پہلا فارسی ہفتہ وار تھا۔ اس کا پورا نام ''احسن الاخبار و تحفۃ الاخیار'' تھا۔ یہ ہندوستان میں مقیم ایرانیوں کے توسط سے شائع ہونے والا پہلا نشریہ تھا جو ۹ نومبر ۱۸۴۴ء (مطابق ۲۷ شوال ۱۲۶۰ھ ق) میں شائع ہوا اور اس کا پہلا شمارہ رمضان ۱۲۶۷ھ میں ایران پہنچا۔ پہلے میرزا محمود خراسانی اور پھر میرزا محمد علی شیرازی کی ادارت میں شائع ہوا۔ یہ بیشتر جنوبی ہند میں نشر ہوتا، ساتھ ہی کچھ سرکاری اداروں کو بھی بھیجا جاتا تھا۔ (۲۹) یہ اخبار ممکن ہے مطبع امریکن مشن سے شائع ہوتا ہو، جو ویسے تو ''۱۸۱۶ء میں قائم کیا گیا تھا لیکن وہاں سے ۱۸۴۴ء سے فارسی میں بھی چھپائی کا کام شروع ہو گیا تھا۔'' (۳۰) عبدالرزاق کے مطابق احسن الاخبار کی تاریخ اشاعت ۹ نومبر ۱۸۴۲ء ہے۔ اس میں سال اشاعت درست نہیں۔

سرورق پر اوپر پہلے 'احسن الاخبار'، اس کے بعد ایران کی قومی علامت 'شیر و خورشید' کی تصویر (جو پہلی بار ہندوستان کے کسی ایسے اخبار میں چھپا جو براہ راست ایران سے وابستہ نہیں تھا۔) اور پھر 'تحفۃ الاخیار' لکھا ہوتا تھا۔ اس تصویر کی سائز بعد میں تبدیل ہوتی رہی۔ اس کے نیچے ناشر کا نام، قیمت اور اخبار کی تعریف میں کوئی شعر درج ہوتا۔ اس کے پہلے صفحہ پر تہران اور دوسرے صفحات پر ایران کے دوسرے شہروں سے متعلق خبریں شائع ہوتیں۔ اس میں انگریزوں کے ایران اور ایرانیوں کے ساتھ ان کے سلوک کی سخت الفاظ میں تنقید کی جاتی۔ غالباً اسی سبب بعد میں اس کی ایران درآمد پر پابندی لگا دی گئی اور بالآخر دس سال شائع ہونے کے بعد ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء یا اس کے کچھ دنوں بعد بند ہو گیا۔ اس کی کچھ جلدیں تہران یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں موجود ہیں۔ (۳۱)

اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ اپنی محدود ذرائع رسل ورسائل کے باوجود دہلی اور قلعہ معلیٰ کی خبریں صحت کے ساتھ شائع کرتا تھا (۳۲) اور اس لحاظ سے اس کی بڑی تاریخی اہمیت ہے۔ رسالہ ''اردو'' (اورنگ آباد) میں شائع ایک مضمون سے احسن الاخبار کے دو فارسی اقتباسات کے ترجموں سے تھوڑی بہت معلومات بہم پہنچتی ہیں۔ یہ دونوں اقتباسات مرزا اسد اللہ خان غالب سے متعلق ہیں جو بلاشبہ تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اور ہر اہل ذوق کے لئے دلچسپی کا باعث۔ پہلی خبر احسن الاخبار میں ۲۵/ جون ۱۸۴۷ء کو شائع ہوئی تھی:

''مرزا اسد اللہ خان بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی بھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے کہ یہ معززین شہر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''(۳۳)

اس سے متعلق دوسری خبر جو احسن الاخبار جلد ۴، شمارہ ۲،۱۷/ جولائی ۱۸۴۷ء کو شائع ہوئی ہے:

''مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا، اس کا فیصلہ سنادیا
گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینہ کی قید بامشقت کی اور دوسو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر دوسو روپئے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ مہینہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا اور مقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر پچاس روپئے زیادہ ادا کئے جائیں تو مشقت معاف ہوسکتی ہے۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا، قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت و مشقت برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج بہادر کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ

عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھالیا جائے۔ یہ بات عدل وانصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت وحشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے، ایسے معمولی جرم میں اتنی سخت سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہو۔‘‘ (۳۴)

O

منابع وماخذ:

1. Dr. N.K. Ninha, the days of John Co.(Ed. A.C.Dasgupta), Page-3

۲۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ،ص:۱۲۲

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً،ص:۱۶۹

۶۔ بحوالہ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ،ص:۱۶۹۔۱۷۰

۷۔ ایضاً

8. Samarjit Chakrabarti,The Bengal Press (1818-1868),Firma KLM Pvt.Ltd.,Calcutta,1st Ed., July1976,P.189

۹۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ،ص:۱۷۰

10. Pernau, Margrit & Yunus Jaffery, Information and the Public Sphere, Persian Newsletters from Mughal Delhi; OUP, New Delhi, I editon, 2009, p. 21

11. Ibid. p.22

12. Ibid.

۱۳۔ آئینہ سکندر، ۲۱رجنوری ۱۸۳۳ء، روزہ دوشنبہ، شمارہ:۹۹

۱۴۔ آئینہ سکندری، ۲۶راگست ۱۸۳۳ء، شمارہ نمبر ۱۳۰

۱۵۔ غالب، کلیاتِ نثر فارسی، ص:۱۴۷

۱۶۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ،ص:۲۳۸

۱۷۔ آئینہ سکندر، ۲۱ رجنوری ۱۸۳۳ء شمارہ نمبر ۹۹، ص: ۱۴
۱۸۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: ۲۳۸
۱۹۔ آئینہ سکندر ۲۰ رجون ۱۸۳۶ء
۲۰۔ شمس الاخبار، ۲۴ را کتوبر ۱۸۲۳ء، شمارہ ۲۲، بحوالہ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: ۱۶۸
۲۱۔ امداد صابری، متذکرہ، ص: ۲۳۲
۲۲۔ محمد عتیق صدیقی، متذکرہ، ص: ۲۵۸
۲۳۔ خطبات گارساں دتاسی، ص: ۳۱
۲۴۔ امداد صابری، متذکرہ، ص: ۲۳۲
25. Natrajan, History of Indian Hournalism, Page-49
۲۶۔ سراج الاخبار ۱۲ رجنوری ۱۸۴۴ء
۲۷۔ ایضاً، ۲۸ رجون ۱۸۴۳ء
۲۸۔ ایضاً
۲۹۔ حسن انوشہ، متذکرہ، ص۔ ۹۷
۳۰۔ نادر علی خان، ہندوستانی پریس، ص: ۸۶۔۸۵
۳۱۔ حسن انوشہ، متذکرہ، ص۔ ۹۷
۳۲۔ اردو (اورنگ آباد) اکتوبر ۱۸۳۵ء
۳۳۔ ایضاً
۳۴۔ ایضاً

مشتاق عالم قادری

امتیاز علی خاں عرشی بہ حیثیت غالب شناس

مرزا غالب کے انتقال کے چونتیس سال دس ماہ بعد مولانا امتیاز علی خاں عرشی دسمبر 1914 کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کا تعلق افغانستان کے مشہور قبیلہ یوسف زئی سے ہے۔ آباواجداد کئی پشتوں سے رام پور میں آباد ہیں خاندان کے اکثر افراد سپہ گری سے وابستہ تھے۔ کئی افراد بادشاہوں کے دربار میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن رحم باز خاں کے اکلوتے لخت جگر امتیاز علی خاں عرشی کے دادا نے خاندانی روایت سے بغاوت کر کے اپنا راستہ الگ کیا۔ سپہ گری کے پیشے کو خیر آباد کہہ کر علم عمل کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ یہ خاندان میں پہلے فرد تھے جنھوں نے اپنے خاندانی پیشے پر علم فضل کو فوقیت دے کر اس میں خوب نام ونمود پیدا کیا اور خاندان کی عزت وشہرت میں چار چاند لگائے۔ والد کی چند شادیاں ہوئیں لیکن دو بیٹے ہی زندہ رہے۔ باقی راہی ملک عدم ہو گئے۔ اس ضمن میں مالک رام لکھتے ہیں:

"عرشی صاحب کی ولادت جمعرات کے دن 29 رمضان 1322ھ مطابق دسمبر 1904ء کو ہوئی۔ اس کے ڈھائی برس بعد ان کی والدہ رحلت کر گئیں، چھ سات مہینے بعد ان کے والد جناب مختار نے دوسرا نکاح

کرلیا، اس سے بڑے دوررس نتائج پیدا ہوئے۔ حالاں کہ سوتیلی ماں ان
کی دل جوئی کا پورا خیال رکھتی تھیں، لیکن دل سے والدہ کی محبت سے محروم
ہو جانے کا احساس کبھی زائل نہ ہوا۔''[1]

امتیاز علی خاں کا تعلق اردو کے ان نامور محققین میں شامل ہے جنہوں نے غالب شناسی کو بام عروج بخشا۔ تدوینی، تحقیقی، ترتیبی اور متنی کارناموں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اسی لیے ان کا شمار اردو کے مقتدر غالب شناسوں اور مرتبین کلام غالب میں ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو پشتو زبان پر بھی کامل عبور تھا۔ اردو زبان ان معنوں میں خوش نصیب زبان ہے جسے مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسا محقق ملا۔ جو تحقیق و تدوین کی روایت کا امین و پاسدار ہے۔ اس میدان میں ان کے کارہائے نمایاں آب زر سے لکھنے قابل ہیں۔ ان کی پوری زندگی تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ اس مشغلے سے انہیں حد درجہ انسیت تھی۔ یہ علمی کمال انہوں نے رضا لائبریری رام پور سے حاصل کیا۔ کتب خانے میں ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے جہاں انہوں نے زندگی کے پچاس سال صرف کیے۔

امتیاز علی خاں عرشی نے مختلف علمی میدانوں میں اپنی قابلیت کے سکے جمائے۔ ارباب علم و دانش نے ان کی تحریروں اور کارناموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی تحریروں میں دیدہ ریزی، فکری عمق، اور تنوع کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔ وہ متنی نقاد، محقق، اور ماہر غالبیات کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ یوں تو غالب شناسی میں کئی محققین کی خدمتیں قابل صد تحسین ہیں لیکن اس میدان میں جو مقام امتیاز علی عرشی کو حاصل ہے وہ ایک دو کو چھوڑ کر کسی کو حاصل نہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عرشی نے غالب، تحقیق و تدوین کو اپنا موضوع کیوں بنایا؟ غالب سے ان کی دلچسپی کا کیا راز ہے؟ یہ دونوں سوال اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی پہلی کاوش بہ شکل مکاتیب غالب 1937 کو سامنے آئی۔ مکاتیب غالب ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مرزا اسد اللہ خاں غالب نے رام پور کے امرا کو لکھے تھے۔ ان مکاتیب کی تحقیق و تدوین میں امتیاز علی عرشی نے بڑی جاں فشانی کا مظاہرہ کیا۔ نیز مرزا کی سوانحی کیفیات کی ترتیب میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ مرزا کی سوانحی کیفیات، فن، انشا پردازی، سہل ممتنع، خصوصیات کلام اور واقعات کو انہی کے خطوط کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ لکھتے ہیں:

> ''لیکن مرزا صاحب کی سوانح لکھتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صرف وہی واقعات بیان کیے جائیں جو خود میر صاحب نے ان مکاتیب میں دربار رام پور یا وابستگان رام پور کو تحریر کیے تھے۔''2

ان مکاتیب کی ترتیب سے قبل مرزا کے حوالے سے اچھا خاصا کام ہو چکا تھا۔ جیسے یادگار غالب، غالب، غالب نامہ جیسی کتابیں منظر عام پر آچکی تھیں اور ان کتابوں میں غالب کے والے سے کافی بحثیں بھی کی گئی تھیں لیکن اب اس کام کی کوئی نہ کوئی وجہ جواز بھی ہونی چاہیے۔ بقول عرشی:

> ''ان تالیفات کا دائرہ مرزا صاحب کی ساری کائنات ادب کو محیط ہے جس کے سبب سے ان میں خاص انشائے اردو سے سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ حالاں کہ یہ صنف ادب ان کی خصوصیت خاصہ تسلیم کی گئی ہے۔ جس میں ہندوستان کا کوئی ادیب بغیر استثنا آج تک شرکت کی جرأت نہیں کرسکا ہے۔''3

امتیاز علی خاں عرشی نے مکاتیب غالب کی ترتیب وتدوین میں سائنٹفک طریق کار کو مدنظر رکھتے ہوئے تحقیق متن میں ایسے بیش بہا اضافے کیے جو یقیناً اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں بھی غالب کی شخصیت کو ان خطوط نے ہی نمایاں کیا ہے۔ وہ اس بنا پر کہ ان خطوط سے غالب کے آخری ایام اور ان کی زندگی کے اہم پہلوؤں سے قدرے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے زندگی کے آخری ایام تک تحقیق غالب کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ اس سلسلے میں ان کا دوسرا بڑا کارنامہ انتخاب غالب ہے۔ نواب رامپور سے مرزا کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ نواب رام پور نے مرزا غالب سے کہا تھا کہ وہ اپنے فارسی اور اردو کلام کے منتخب حصے ارسال کریں۔ مرزا نے 1866 میں اپنے کلام کے دو نسخے ارسال کیے۔ نواب رام پور نے ملاحظہ کے بعد یہ نسخے ناظمین کتاب خانہ کے حوالے کر دیے۔ یہ وہ دور تھا جب فارسی زبان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ لوگ اس زبان میں لکھنا پڑھنا اور بولنا اپنی شان سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے فارسی کلام کو شعبہ دواوین میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ زمانے کی بے اعتنائی کی وجہ سے اردو کلام کو وہ وقعت نصیب نہ ہو سکی۔ اس ضمن میں امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

''سرکار کے ملاحظہ کے بعد یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیے گئے۔
اس عہد کے منتظمین کتب خانہ نے صرف فارسی انتخاب کو شبہ دواوین میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا اور رسم زمانہ کے مطابق انتخاب اردو کو ناقابل التفات خیال کر کے کتاب خانہ کے ردی گھر میں گمنامی کی گہری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے۔''4

مولانا نے جب اردو انتخاب کو ردی کی ٹوکری میں دیکھا تو انہیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ یہ کتنا قیمتی اثاثہ ہے۔اس سے غالبیات کے فن میں بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے۔یہ ان کے ذوق تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔تحقیق کی دنیا میں سب سے اہم پہلو کسی شے کی ازسرنو دریافت بعدہٗ ترتیب وتدوین۔اس حوالے سے مولانا کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔احوالے سے بشیر حسین زیدی کی رائے ملاحظہ ہو:

''مولوی امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانہ نے ردی کی متاع کاسد کا جائزہ لیتے ہوئے دوسرے نوادرات کے ساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کیا اور مرزا صاحب کی تھکی ہوئی زندگی کا کارنامہ ملک کے ارباب ذوق کے لیے محفوظ ہو گیا۔''5

دیوان غالب کی ترتیب وتصحیح ان کا وقیع کارنامہ ہے۔غالب وہ خوش نصیب شاعر ہے جس کے کلام کو دنیا کی تقریباً بڑی زبانوں میں منتقل کیا گیا ہے اور ان کے کلام کی مقبولیت میں ہمیشہ اضافہ ہوا ہے۔آج تک غالب کی مقبولیت کا سورج کبھی بھی گرہن کا شکار نہیں ہوا ہے۔کیوں کہ غالب کی شاعری میں فصاحت وبلاغت اور لفظوں کی صورت گری بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط،شاعری اور فارسی کلام کے تعلق سے تلاش وجستجو کا سلسلہ جاری وساری ہے۔آئے دن تفہیم غالب کے نت نئے گوشے واہ ہو رہے ہیں۔دیوان غالب کو ترتیب دینے والوں کی ایک طویل فہرست ہے ان میں مالک رام،مفتی انوار الحق،مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام نمایاں ہے۔نسخہ حمیدیہ اغلاط سے مبرا نہیں۔اس نسخے میں امیر مینائی وغیرہ کا کلام بھی شامل

ہوگیا ہے۔ جیسے:

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا
دل لیجئے مگر میرے ارماں نکال کے 6

دیگر مرتبین کلام غالب کی بہ نسبت مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا ترتیب دیا ہوا نسخہ تحقیق وتدوین کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ اس نسخے کی خوبی کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبدالطیف کو سب سے پہلے غالب کے سارے اردو کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا خیال آیا۔ مگر ان کے تیار کیے ہوئے مواد کا صرف نصف حصہ چھپ سکا۔ اکرام نے پہلے غالب نامہ اور بعد میں ارمغان غالب میں یہ کوشش کی مگر ادھوری۔ مالک رام نے نسخہ حمیدیہ کے منتخب اشعار اور کچھ متفرق اشعار مروجہ دیوان میں شامل کر کے عام پڑھنے والوں کے لیے ایک اچھا ایڈیشن تیار کر دیا۔ مگر زیر نظر ایڈیشن جو اردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب امتیاز علی عرشی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے، نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت، نسخوں کے اختلاف کی نشاندہی شرح اور ضروری حواشی کے لحاظ سے اب تک کی ساری کاوشوں پر بھاری اور اردو میں ادبی تحقیق اور عالمانہ نظر کا ایک قابل فخر اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ 7

امتیاز علی عرشی کو بھی غالب کے دواوین رائجہ میں غلطیوں کا بھرپور احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ترتیب شدہ نسخے میں ان غلطیوں سے دور رہنے کے لیے ترتیب اشعار میں تاریخی ترتیب کو اہمیت دے کر ایک ایک راہ نکالی۔ یہ قدم اس حوالے سے بالکل نیا تھا جو ان کا زائیدہ فکر اور باب تحقیق وتدوین میں ایک خوشگوار اضافہ تھا۔ عرشی خاں کے مطابق:

''میری کوشش تو یہی رہی کہ دیوان کے تمام اشعار کی واقعی، یا تقریبی تاریخ نظم کا پتہ چل جائے۔ مگر عام حالات میں اکثر شعروں کا صرف تاریخی

عہد متعلق ہوسکا ہے۔اس کام میں دیوان غالب کے ان نسخوں سے بھی
مدد ملی جو مختلف زبانوں میں لکھے گئے یا چھپ کر شائع ہوئے۔ 8

نسخہ حمیدیہ کے شائع ہونے کے بعد جن افراد نے اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ان میں مولانا عرشی قابل ذکر ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے قلمی نسخہ دیوان غالب کی روشنی میں دوسرے شائع شدہ متداول دیوان کی بے شمار غلطیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کا ذکر کیا۔ مفتی انوار الحق کے نسخے کی املائی تاریخی، اختلاطی غلطیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مفتی صاحب نے یہ کام اس زمانے میں انجام دیا تھا جب وہ محکمہ تعلیمات کے افسر تھے۔اس لیے تصحیح کا حق ادا نہ کر سکے۔اس میں ہر طرح کی غلطیاں راہ پا گئیں۔میں نے ان کا ذکر حواشی میں کر دیا۔'' 9

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیوان غالب کی ترتیب، حواشی، املا، اختلاف نسخ، مآخذ کی چھن پھٹک اور نسخوں کے باہمی تقابل میں انتہائی کوشش و کاوش کا پاس ولحاظ رکھا ہے۔حتی المقدور یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ املا اور اشعار کو مرزا نے جس انداز سے تحریر کیا اس نسخے میں اسی انداز سے درج کیا جائے۔موصوف نے اس پر عمل بھی خوب کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''اس نسخے کی کتابت میں موجودہ اصول اور میرزا صاحب کی پسندیدگی دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔چناں چہ آپ یاے معروف و مجہول اور ھاے مخلوط پائیں گے اور فارسی لفظوں میں ''ذ'' کی جگہ ''ز'' اور خورشید کے بجائے ''خرشید'' بھی دیکھیں گے۔بعضے لفظوں کو انہوں نے دو طرح لکھا تھا۔مثلاً ''جائے ھے'' (یعنی ہمزہ کے ساتھ) اور ''جاے ھے'' (یعنی بغیر ہمزہ کے) ان جیسی صورتوں میں وہ شکل اختیار کی گئی ہے جو موجودہ بول چال کے مطابق اور ان کی آخری تحریر کے بھی موافق تھی۔ 10

مذکورہ عبارت سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ نسخہ عرشی کی تدوین وترتیب غالب کے اصول اور جدید تحریر کردہ اصولوں کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔جیسا کہ اس عہد کا

رواج تھا۔اس دور میں اعراب بالحروف کا چلن تھا اور یہ چلن مولانا امتیاز کے دور میں تقریباً متروک ہو چکا تھا۔اب سیدھے سادے انداز میں لکھنا عوام وخواص اپنا چکے تھے ۔مولانا لکھتے ہیں:

> ''میرزا صاحب کے زمانے میں بلکہ ان کے بہت بعد تک اُس اور اُدھر وغیرہ الفاظ کو بہ قاعدہ اعراب بالحروف ''اوس'' ''اودھر'' لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی اسی کا التزام رکھا تھا۔ میں نے ''واؤ'' گرکراس کی جگہ پیش کا التزام کیا ہے۔ 11

مرزا کی تحریروں میں یاے اضافت اور توصیفی میں کوئی فرق نہیں ملتا ہے بلکہ اس کو سیاق کے حوالے کر دیا گیا ہے جو قدیم اردو میں یقیناً ایک بڑی الجھن ہے بلکہ سیاق سے ہٹ کر بھی اس کو پیش کیا جاسکتا ہے۔مولانا نے موقع اور محل نیز رائج اردو کے ساتھ اس کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اور تحقیقی شعور نیز املائی مہارت کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔اس دور میں ایسی تبدیلیاں کرتے ہوئے ماہرین فن یا دیگروہ اشخاص جن کو پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا کتراتے تھے۔ بلکہ اہل زمانہ بھی اس کو ناپسند کرتے تھے لیکن مولانا نے اردو کی بدلتی صورتوں پر اپنی گرفت اور نظر بینی سے اس کو محسوس کر لیا کہ آیندہ یہ صورت اردو ادب وزبان کی زینت بنے گی اور اس تبدیلی کو آپ نے خود پسند کیا اور ایک حتمی اصول کی طرح اس تدوین میں اس پر عمل کیا۔جدت طرازی، ندرت، نیز اردو کی نمایاں تبدیلیوں پر گہری نظر کا ثبوت دیا۔مولانا کے مطابق:

> ''اسی طرح یہ کوشش بھی رہی ہے کہ مرکبات اضافی وتوصیفی میں ہمزہ یا زیر ضرور استعمال کیا جائے۔الا یہ کہ ی بہ طور علامت موجود ہو۔''

اس کی مثال یہ ہے:

دماغ عطر پیراہن نہیں ہے
غم آوارگی ہاے صبا کیا؟؟

اس کے پہلے مصرعے کے الفاظ ''عطر پیراہن'' کو بکسرہ را اور بدون کسرہ دونوں طرح سے پڑھا جاسکتا ہے مگر مرزا صاحب نے پہلے

''بوے پیراہن'' لکھا تھا۔جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مقصود شاعر
مرکب اضافی ہے اور اس نے بو کی جگہ عطر اس لیے رکھا ہے کہ اول الذکر
کی تعمیم دور ہو جائے'' 12

نسخہ عرشی میں اختلافات کو حواشی میں ذکر کیا گیا جو اس نسخے کی بہت بڑی خوبی خصوصیت ہے۔ نیز حواشی آسان، عمدہ، پیرایہ بیان دل آویز، سہل نگاری کا نمونہ، زبانی حلاوت وچاشنی کا بھنڈار، فن شاعری کے رموز واسرار کے مغلق وگنجلک مقامات کے گرہ کش افہام وتفہیم میں مددگار، نیز غالب کی شخصیت کے عکاس ہیں۔عرشی خان نے ان حواشی کو اپنی خداداد صلاحیت سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں اختلاف نسخ واشعار کو پیش کیا ہے۔دوسرے حصے میں ان اشعار کے متعلق غالب نے وضاحتیں اور تشریحات کی ہیں، ان کو جگہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

''حواشی کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اختلاف نسخ کو جگہ دی ہے اور اس کا
خط خفی رکھا ہے دوسرے حصے میں جس کا خط جلی ہے۔اشعار کی وہ تمام
تشرتحسیں جمع کی گئیں ہیں جو مرزا صاحب نے احباب کے استفسار پر
تحریر کی تھیں۔ 13

نسخہ عرشی کی دیگر نسخوں پر برتری کی ایک وجہ جواز یہ بھی ہے کہ اس سے قبل جتنے نسخے ہیں وہ سب کے سب رطب و یابس سے لبریز، اغلاط کا مجموعہ، نیز مرزا غالب کی تصویر سے محروم ہیں۔ یہ پہلا نسخہ ہے جو جناب مرزا کے صحت مند کلام کے ساتھ مرزا کی ایک تصویر کا بھی حامل ہے۔ جو اس کی زینت وآرائش اور حسن و جمال میں اضافے کا باعث ہے۔خود عرشی کی زبانی سنیے۔عرشی صاحب اس سبب کو بھی دیگر نسخوں کے مقابلے میں اس کی برتری کی دلیل مانتے ہیں کہ یہ دیگر نسخوں پر کچھ اس وجہ سے بھی فوقیت وترجیح رکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس دیوان کو ایک چیز ایسی دستیاب ہوئی ہے جو پہلے کسی نسخے
کو میسر نہیں یعنی مرزا غالب مرحوم ومغفور کی ایک صحیح اور مستند عکسی تصویر زیب
ورق اول ہے۔'' 14

نسخہ عرشی کی اہمیت ان تمام خوبیوں کی وجہ سے دیگر نسخوں سے بڑھ کر ہے۔ اس میں

املا، حواشی، اختلاف نسخ، تصحیح روایات، تحقیق مسائل، اصول ترتیب و متن۔ مرزا غالب کی تحریروں کو انہیں شکل میں مرتب کرنے کی سعی مشکور کی گئی ہے۔ جس سے دیگر نسخے بالجملہ خالی نظر آتے ہیں۔

غلطیوں کو تو مرزا غالب بھی اپنے دیوان میں پسند نہیں کرتے تھے مرزا غالب دہلی کے چھاپے خانے پر اپنی ناراضگی کچھ اس انداز سے درج کراتے ہیں:

''دیوان اردو چھپ چکا۔ ہائے! لکھنو کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ و چمکا دیا، دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے پر لعنت! صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں، کاپی نگار اور تھا۔ متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو چھپ چکے، حق تصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا تو وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے ناچار غلط نامہ لکھا وہ چھپا۔ بہ ہر حال خوش و ناخوش کی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین مجلد اصحاب ثلثہ کے پاس پہنچ جائیں نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔ 15

لیکن اگر نسخہ عرشی کی بات کی جائے تو یہ مرزا کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے والا، اغلاط دور، حسن و جمال کا مرقع، حسن خط سے الفاظ کو جھکانے والا، جن خوبیوں کو مرزا تلاش رہے تھے ان سب خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ نیز مرتب نے اس کو بنانے، سنوارنے، چمکانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو روبہ عمل لا کے اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جن کو اہل ہوش و خرد تسلیم کر کے داد تحقیق بھی عرشی خان کو دے چکے ہیں۔

نسخہ عرشی انہیں سب خوبیوں کی وجہ سے مرتبہ نسخوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں اس سے بہتر ترتیب دیوان غالب دیکھنے میں نہیں آتی۔

○

حوالہ جات

۱۔نذر عرشی ص ۸ مرتبہ مالک رام ومختار الدین، مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی

۲۔مکاتیب غالب ص 13 مرتبہ عرشی خاں مطبعۃ قمیۃ ممبئی 1937

۳۔ایضاً۔ص 12

۴۔انتخاب غالب ص 2 مرتبہ عرشی

۵۔ایضاً ص 2

۶۔نسخہ حمیدیہ ص 247

۷۔تقریب ص 1 دیوان غالب مرتبہ عرشی خاں مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند اشاعت اول 1958

۸۔ایضاً ص 77

۹۔ایضاً ص 159

۱۰۔ایضاً ص 158

۱۱۔ایضاً 158

۱۲۔ایضاً 158-59

۱۳۔ایضاً 156

۱۴۔ایضاً 159

۱۵۔ایضاً 139

عبدالرحمٰن بجنوری کے غالب

اردو کتابوں پر لکھے گئے دو مقدمات ایسے ہیں جو بعد میں خود علاحدہ کتاب بن گئے۔ایک ''مقدمۂ شعر و شاعری'' اور دوسرا ''محاسنِ کلامِ غالب''۔ان مقدموں کے کتاب بننے کی وجہ ان کی ضخامت نہیں تھی بلکہ ان کی علمی و تنقیدی اہمیت تھی۔ مقدمۂ شعر و شاعری سے اردو تنقید کی باضابطہ داغ بیل پڑی اور محاسنِ کلامِ غالب سے محض چند تذکراتی اصطلاحات اور محدود کلاسیکی شعری تصورات کے بجائے علمی و فکری بنیادوں پر غالب فہمی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ غالب شناسی کے باب میں محاسنِ کلامِ غالب کی اہمیت یہ ہے کہ اس پر جتنی بحثیں ہوئی ہیں، صرف انھیں کو یکجا کر دینا اپنے آپ میں ایک اہم تدوینی کارنامہ ہوگا۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے معترضین سب سے زیادہ ان کی انشاپردازی کو نشانہ بناتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہیے۔ ایک تو یہ کہ ایسی عبارتیں محض تین چار ہی نکلیں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض ایسے جملے جو بظاہر انشاپردازانہ محسوس ہوتے ہیں وہ اس سے بہتر اور مناسب الفاظ میں کہنا مشکل ہے۔ اور وہ محض انشائیہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک تنقیدی تصور بھی کارفرما ہے۔ مثلاً پہلا ہی جملہ جس پر شاید سب سے زیادہ اعتراض ہوا ہے کہ:

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوانِ غالب۔"

مذکورہ جملے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ تنقید کی زبان نہیں ہے۔ صرف انشا پردازی ہے، درست نہیں۔ اس لیے کہ اس جملے میں اول تو شاعری کے بارے میں ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو کہ زمانہ قدیم سے ہی رائج چلا آ رہا ہے یعنی یہ کہ شاعری الہام کی ایک قسم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس جملے سے عبدالرحمٰن بجنوری کا غالب کے بارے میں یہ نظریہ واضح ہوتا ہے کہ وہ غالب کو نہ صرف الہامی شاعر سمجھتے ہیں بلکہ وہ ان کے دیوان کو ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب بھی سمجھتے ہیں۔ مقدس وید نے حیات و کائنات اور انسان کے حوالے سے جو عقیدہ و نظریہ پیش کیا، اس کے بعد دیوان غالب ایک ایسی کتاب ہے کہ جس نے زندگی، انسان اور موجودات پر بنیادی طور پر کلام کیا اور اس پختگی، تکمیلیت، حکمت اور روحانیت کے ساتھ ایک نظامِ فکر پیش کیا جو کہ ایک الہامی وصف ہے۔

محاسنِ کلامِ غالب کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ غالبیات کے باب میں اس کتاب کو بہت سے مباحث میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ مثلاً چند اولیات ملاحظہ ہوں:

(۱) مغربی شعرا سے غالب کا باضابطہ تقابل سب سے پہلے عبدالرحمٰن بجنوری نے ہی کیا ہے۔

(۲) غالب کے دیگر شارحین اور نقادوں کے مقابلے میں عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کی عظمت کا راز محض زبان اور فصاحت و بلاغت کے بجائے ان کے فلسفہ و فکر اور نئے شعری شعور میں تلاش کیا ہے۔

(۳) عبدالرحمٰن بجنوری نے زبان کے حوالے سے کچھ ایسی بحثیں اٹھائیں جو کہ آگے چل کر بہت بعد میں مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر تنقیدی تصورات کا بنیادی موضوع بنیں۔ مثلاً:

...زبان ارضی ہے، شاعری خیالات سماوی۔

...ترسیل و تفہیم کا مسئلہ۔

...لفظ و معنی کے مابین رشتہ۔

...ایک لفظ کا کوئی دوسرا لفظ مکمل طور پر مترادف نہیں ہوسکتا۔

...شاعر کو قواعد شکنی کا حق حاصل ہے۔

(۴) سب سے پہلے عبدالرحمٰن بجنوری نے ہی پوری شدت اور صراحت سے اس نکتے کی

طرف اشارہ کیا کہ غالب صرف مشکل پسند ہی نہیں بلکہ انھیں سہل ممتنع پر بھی قدرت حاصل ہے۔

(۵) آج پیکروں کی تقلیب کو جدید شاعری کا مابہ الامتیاز وصف قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی شاعرانہ وفور میں حواس منقلب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آنکھ سے سننے اور کان سے دیکھنے کا کام لیا جائے وغیرہ۔ لیکن عبدالرحمٰن بجنوری نے بہت پہلے غالب کے کلام میں اس خصوصیت کی نشان دہی کی ہے۔

(۶) آج غالب کی تعبیر و تفہیم مختلف سائنسی، عمرانی اور انسانی علوم کے حوالے سے کرنے کی روش عام ہوگئی ہے۔ لیکن اس رویے کی داغ بیل بھی دراصل عبدالرحمٰن بجنوری نے ہی ڈالی ہے۔

(۷) عبدالرحمٰن بجنوری نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی کہ غالب کا تصور مذہب، خدا اور آخرت، قواعد اور ضابطہ بند مذہبی تصورات سے مختلف ہے۔

اب یہاں غالب کے حوالے سے عبدالرحمٰن بجنوری کے مذکورہ اولیات پر مفصل بحث کی جائے گی۔

(۱) غالب اور مغربی شعرا:

یہ بات تاریخی طور پر درست ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری سے پہلے بھی کچھ نقادوں نے غالب کا تقابل مغربی شعرا سے کیا ہے۔ خود ان میں سے چند نقادوں کا حوالہ عبدالرحمٰن بجنوری نے بھی دیا ہے۔ لیکن عبدالرحمٰن بجنوری کا امتیاز یہ ہے کہ ان کی طرح دیگر ناقدین کو مغرب کی کئی زبانوں فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عبد الرحمٰن بجنوری صرف کئی زبان ہی نہیں بلکہ مختلف علوم و فنون پر بھی ماہرانہ دسترس رکھتے تھے۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری مغربی شعر و ادب سے مرعوب نہیں تھے۔ انھوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ:

''تنازع البقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آرا سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے کہ اگر اس یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیئر، ورڈس ورتھ اور ٹے نی سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہے۔'' (ص ۴)

واضح رہے کہ مذکورہ عبارتیں ۱۹۲۱ء یا اس سے قبل لکھی گئی ہیں۔ یہ وقت ہے جب کہ شاعری کی سطح پر گرچہ مغرب کی مخالفت اکبراللہ آبادی کر چکے ہیں، لیکن تنقید کی سطح پر کوئی ایسی واضح مثال نہیں ملتی ہے۔ اس زمانے میں، پس نو آبادیاتی مطالعات (Post clonial Discourse) تو کیا نو آبادیاتی مطالعات (Clonial Studies) کا بھی کچھ اتا پتا نہیں تھا۔ اس وقت بجنوری نے غالب کے حوالے سے یہ بحث چھیڑی ہے۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ غالب کا موازنہ مغرب کے شعرا سے کرنے کی روش عبدالرحمٰن بجنوری نے قائم کی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہتے کہ انھوں نے مشرق و مغرب کے موازنے کو غلامانہ ذہنیت سے تعبیر کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری اس بات پر بھی مصر ہیں کہ غالب کا موازنہ کسی مغربی شاعر سے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تقابل کی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو شاعرانہ فکر و فلسفہ کی سطح پر صرف گوئٹے ہی ایسا شاعر ہے جو غالب کا ہم پلہ ہے۔ حالاں کہ اس طرف ان سے قبل اقبال نے بھی اشارہ کیا ہے، عبدالرحمٰن بجنوری نے اس سلسلے میں اقبال کی تائید بھی کی ہے۔

(۲) غالب کی عظمت کا راز:

عبدالرحمٰن بجنوری سے قبل غالبیات کے سرمایے پر نظر ڈالیے تو زیادہ تر زبان و بیان کی خوبیوں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ لیکن بجنوری کے نزدیک غالب کی اصل عظمت ان کے فکر و فلسفہ میں مضمر ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے نظریۂ حیات و کائنات پر مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری غالب کی بلندیِ فکر اور دانشوری کے حد درجہ مداح ہیں۔

(۳) تصورِ زبان اور غالب:

عبدالرحمٰن بجنوری کا سب سے بڑا کمال زبان، لفظ، معنی اور قواعد کے حوالے سے ان کے ان تصورات میں مضمر ہے جو بہت بعد میں مابعد جدید تنقیدی تصورات میں اساسی موضوع بنے۔ اس ضمن میں پہلے ان کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

> ’’زبان ارضی ہے اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں۔ ان دونوں
> کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم تیار کرنا ہے۔‘‘
>
> ’’غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے
> یہاں تک کہ بعض جگہ چاک ہو گیا ہے اور عریاں بدن اندر سے نظر آتا ہے۔‘‘

''مرزا غالب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مؤلفانِ لغت نے طلبا کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ توام بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا غالب الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو بھی خوب جانتے ہیں۔''

''مرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے۔ اس کے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طبا طبائی نے چند مناسب اور معقول اعتراضات کیے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے۔ علم القواعد کا کام تقریر اور تحریر میں صحت پیدا کرنا ہے۔ کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں۔ اس لیے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لیے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے..... شیکسپیئر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے یا ان کی خاطر اپنی درسیات میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے۔''

مذکورہ اقتباسات سے اندازہ کیجیے کہ زبان کے حوالے سے جو بحثیں آج کی تنقید کا بہت بنیادی موضوع بنی ہوئی ہیں۔ ''ساخت شکنی'' پر زور دیا جا رہا ہے۔ نئی زبان وضع کرنا ہی تخلیق کار کی معراج ہے۔ زبان کی حدود و قیود بھی زیرِ بحث ہیں۔ زبان کی ماہیت اور مقاصد پر کلام کیا جا رہا ہے۔ زبان، اظہار، اخفا اور تخلیق کے حوالے سے کتنے فکری ابعاد روشن ہوئے ہیں۔ لیکن آج سے سو برس قبل عبدالرحمٰن بجنوری جب یہ کہتے ہیں کہ زبان ارضی ہے، شاعری سماوی... دونوں میں وصل مشکل ہے۔ دو لفظ مکمل طور پر مترادف نہیں ہو سکتے اور قواعد کی قید شاعرانہ وجدان میں مخل ہوتی ہے تو یقیناً عبدالرحمٰن بجنوری کے مذکورہ خیالات کو محض غالب کی بے جا طرف داری اور انشا پردازی پر محمول کرنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

(۴) ترسیل و تفہیم:

جدیدیت کے زیر اثر ۱۹۶۰ء کے آس پاس یہ مسئلہ بہت سلگنے لگا تھا کہ مصنف، متن اور قاری کے مابین کیسا رشتہ ہونا چاہیے۔ متن کے معنی کس طرح متعین کیے جائیں۔ متن میں معنی کی عدم ترسیل کو کس طور پر حل کیا جائے۔ متن سمجھ میں نہ آنے پر مصنف ذمہ دار ہے یا قاری کی نارسائی قصوروار؟ وغیرہ۔ لیکن عبدالرحمٰن بجنوری اس بحث کو ۱۹۲۱ء میں کس طرح اٹھاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

''دیوان غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہے۔ تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب سے پرواز کے بعد مجبوراً واپس آجاتا ہے گویا ایک دائرہ ہے جس سے گریز ناممکن ہے... گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ حصہ دوم میں ہے یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا... گوئٹے نے جواب دیا یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ ان مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامی سے نہیں اکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیر ہے۔ اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمال فن ہے۔ اور اس بات پر اصرار نہ کرنا چاہیے کہ اس کے پس پشت کیا ہے۔ لیکن بچے جب آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشتِ آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔''

(۵) پیکروں کی تقلیب:

پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ نئی شاعری کی ایک امتیازی شناخت یہ بھی ہے کہ اس میں پیکروں کی تقلیب ہو جاتی ہے۔ مثلاً آنکھوں سے لمس کا کام لیا جائے یا لمس میں بصارت پیدا ہو جائے وغیرہ۔ لیکن بہت پہلے عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کی ایک اہم خصوصیت کے طور پر حواس کا منقلب ہو جانا بھی دریافت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بودلیر (Bau delaire) لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہو

جاتے ہیں۔ آنکھیں پردۂ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ پرشور مقامات میں
خفیف سے خفیف آواز کو سننے لگتے ہیں۔ اور شور سے بالکل آشنا رہتے
ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیاے عالم اپنی صورت
سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں۔"

(٦) علوم وفنون کے حوالے سے غالب کی تفہیم:

آج مختلف سائنسی، جغرافیائی، فلکیاتی، عمرانی اور فلسفیانہ علوم وفنون کے حوالے سے غالب کی تفہیم وتعبیر کی روش بہت عام ہوگئی ہے۔ لیکن دراصل اس روش کی باضابطہ بنا عبدالرحمٰن بجنوری نے ہی ڈالی ہے۔ ورنہ ان سے پہلے غالب کو عام شعرا کی طرح لفظ، روانی، سادگی، مشکل پسندی، تشبیہ واستعارہ اور صنائع وبدائع کی روشنی میں ہی سمجھنے اور ان کی تحسین وستائش کا رواج تھا۔ لیکن یہاں ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے کلام پر علوم وفنون کا غیر ضروری اور جبریہ انطباق کہیں بھی نہیں کیا ہے۔ جیسا کہ آج کل کچھ کم نظر ناقدین نے یہ شیوہ اپنا رکھا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کو اس بات کا بھی دعوانہیں ہے کہ غالب تمام علوم وفنون پر ماہرانہ دسترس رکھتے تھے بلکہ عبدالرحمٰن بجنوری نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اپنے زمانے کا جو عبقری دماغ ہوتا ہے اور اس کے اندر خلاقانہ قوت ہوتی ہے اس کی روح میں علوم وفنون کا عطر فطری طور پر رچ بس جاتا ہے۔ اس ذیل میں ان کا یہ اقتباس یہاں نقل کرنا بامعنی ہوگا۔ ملاحظہ کیجیے:

"مسئلۂ ارتقا کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون، اسپنسر، رسل
والی، ہیکل، وائرس، منڈل وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک
دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتہ لگایا۔ میری رائے یہ ہے کہ ہر عہد کی
روح العصر ہوتی ہے جس کو المانی کہتے ہیں۔ وہ روح القدس کی طرح
حسبِ ضرورتِ زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے۔ مرزا غالب نے بھی مسئلۂ
ارتقا کو پہچانا ہے۔"

(جب کہ) "ڈارون اور مرزا غالب ہم عصر ہیں گو دونوں کو ایک دوسرے کا کچھ بھی علم نہ تھا۔"

(۷) غالب کا تصورِ خدا:

بعض کم نظر یہ سمجھتے ہیں کہ غالب خدا، مذہب، آخرت، جنت، دوزخ، فرشتہ وغیرہ کے انکاری ہیں۔ حالاں کہ اصل مسئلہ انکار کا نہیں بلکہ تعبیر و تصور کا ہے۔ یقیناً غالب خدا اور مذہب کے انکاری نہیں بلکہ ان کا تصور مختلف ہے۔ وہ مذاہب کے ضابطہ بند تصور سے بیزار ہیں بلکہ ان کی تضحیک بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ اصل میں ذات باری کے وجود کے قائل ہیں۔ یہ نکتہ عبدالرحمٰن بجنوری نے بخوبی پالیا تھا۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''ذات خداوندی گو جملہ مذاہب کا مقصود ہے۔ خدا تعالیٰ خود طریق وملت کی قید سے مبرا ہے۔ مرزا غالب بھی کسی ارضی مذہب کے پابند نہیں۔''

سچ تو یہ ہے کہ ''محاسنِ کلامِ غالب'' میں فراہم کی گئی بنیادوں اور اس محور سے آج تک غالب شناسی آزاد نہیں ہو سکی ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے پہلی بار باضابطہ طور پر غالب کو روایتی شعریات اور صنائع و بدائع کی خوبیوں سے نکل کر تازہ کار فلسفہ و فکر اور عصری علوم و فنون کی روشنی میں دیکھنے اور پرکھنے کی روش کا آغاز کیا اور ان کے اسی نقطۂ نظر کا اثر تھا کہ غالب ہر دور کا شاعر ہو گیا اور کلامِ غالب میں تلاشِ معنی کا عمل قیامت تک جاری رہے گا۔

مشیر احمد

غالب کے خطوط میں طبی اصطلاحات والفاظ

جب ہم خطوط کی بات کرتے ہیں اور اس کے خط وخال کو گہرائی سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر خطوط خیر وعافیت دریافت کرنے یا اپنی خیرت سے مکتوب الیہ کو باخبر کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں، لیکن غالب نے اپنے خطوط میں جس جدت کا مظاہرہ کیا ہے اور خیر وعافیت دریافت کرنے کے وسیلے کو جس طرح علم وحکمت سے معمور کیا ہے، اس سے ان کی فنی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے خطوط میں، ادبی، علمی اور لغوی مباحث کی کثرت کے علاوہ ان میں تاریخی، سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا ذکر بھی جا بجا ملتا ہے، مزید یہ کہ غالب کے مخصوص اسلوب کی وجہ سے ان کے خطوط اور بھی توانا اور دلچسپ ہوگئے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر کا عنصر، تخیل کی کارفرمائی اور فلسفیانہ رنگ غالب ہے، جب کہ خطوط میں وہ بے تکلف باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں معاصرین کا ذکر بھی بہت اہتمام سے کیا ہے۔ شعرا کے کلام پر رائے اور مشکل اشعار کی تشریح ان کے خطوط میں بکثرت موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطوط میں اپنے زمانے کی تہذیب ومعاشرت کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ ان تمام مباحث کے علاوہ ان کے خطوط میں بعض طبی اصطلاحات کا بھی علم ہوتا ہے، جس کا انھوں نے بہت خوبی سے بیان کیا ہے اور بعض موقع پر اس کی وضاحت بھی پیش کی ہے۔ اس مضمون میں انھیں طبی

اصطلاحات رعناصر کے تعلق سے گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طب یونانی کا مختصر تعارف پیش کر دیا جائے۔

طب یونانی قدیم طریقۂ علاج ہے، یہ یونان میں شروع ہوئی۔ اس کے بانیان میں بقراط اور جالینوس وغیرہ کا نام اہم ہے۔ طب یونانی کی ابتدائیں تو یونان میں ہوئی لیکن عرب ممالک میں اسے کافی شہرت ومقبولیت ملی۔ برصغیر میں بھی اس کے مختلف مراکز قائم ہوئے۔ چنانچہ جب یہاں مسلم حکومتیں قائم ہوئیں تو اس طریقۂ علاج کو کافی تقویت ملی۔ تاریخی تناظر میں جب ہم دیکھتے ہیں تو اس کا سلسلہ غزنی عہد سے لے کر مغلیہ دور تک جاری نظر آتا ہے، یہی وہ زمانہ ہے جب یہ ترقی کی انتہا پر تھی اور خاص وعام میں مقبول بھی تھی۔ اس زمانے میں یونانی علاج ومعالجہ کو ہی ترجیح دی جاتی تھی اور دوسرا طریقہ غیر معتبر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے نقوش ہمیں تاریخی اوراق اور داستانوں میں بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

طب یونانی کو حکمت کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ 1857 کے بعد جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے، تو دیگر علوم وفنون کی طرح طب یونانی کی ترقی بھی متاثر ہوئی اور اس کی جگہ جدید طب (ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی) نے لے لی۔ آج طب یونانی متبادل طب کی حیثیت سے اپنا اثر ورسوخ برقرار رکھے ہوئے ہے، یہ بات دیگر ہے کہ طب یونانی میں مختلف امراض کا ویسا علاج ممکن نہیں ہے جیسا کہ طب جدید میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اہمیت و افادیت کم ہوتی جارہی ہے، لیکن ہندوستان کی حد تک یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہاں سرکاری سطح پر طب یونانی کو فروغ دیا جارہا ہے اور اس میدان میں متعدد طبی ادارے اور ہسپتال اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم غالب کی تحریروں کا جائزہ لیں گے کہ ان میں طب یونانی کا کیا عمل دخل رہا ہے۔ غالب کے زمانے میں طب یونانی کے عروج وترقی کا دور ختم ہو چکا تھا لیکن ان کے خطوط یا کلام پر طب یونانی کی چھاپ دیکھ کر اس کے اثر ورسوخ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے یہاں طبی امور سے متعلق بعض اصطلاحات رعناصر کا علم ہوتا ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1869-1797) اپنے معاصر حکیم مومن خاں مومن کی طرح طبیب نہ تھے۔ لیکن ان کے خطوط اور کلام میں طب کی

متعدد اصطلاحات رعناصر زیر بحث آئے ہیں، جس سے یہ اندازہ بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ طبی امور میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، ساتھ ہی اس میدان میں ان کے تجربات ومشاہدات کا بھی علم ہوتا ہے۔

جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ایک مضمون راقم التحریر کی نظر سے گزرا ہے، جس میں غالب کی شاعری میں شامل طبی اصطلاحات رعناصر کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہاں جس مضمون کا ذکر ہو رہا ہے وہ ''غالب اور طب قدیم'' کے نام سے مولانا حکیم محمود احمد صاحب برکاتی کا تحریر کردہ ہے، جو ''حالات غالب'' مرتبہ ڈاکٹر عقیل احمد (انٹرنیشنل اردو پبلیکیشنز دریا گنج، دہلی 1999) میں شامل ہے ۔اس مضمون میں انھوں نے طب قدیم یا طب یونانی سے متعلق بعض اہم امور کی نشاندہی کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا خلاصہ یہاں پیش کر دیا جائے:

1۔ طب قدیم بھی ایک زمانے میں عروج وارتقا کی منزل میں تھی، اسے قبول عام حاصل تھا۔

2۔ علاج کے دوسرے طریقے پر فائق وفاتح تصوّر کی جاتی تھی۔

3۔ اس کے نظریات واصطلاحات شعروادب میں بھی اپنی جگہ نکال لیتے تھے۔

4۔ زبانوں میں صرف اردو زبان کی بات کی جائے تو سودا سمانا، بخار نکالنا، نزلہ گرنا وہ روزمرہ اور محاورے ہیں جو اردو زبان وادب کو صرف طب قدیم نے دیے ہیں۔

5۔ غالب کی وفات کے بعد کا دور وہ ہے کہ فرنگیوں نے مسلمانوں کو جہاں بانی کے مسند سے اٹھا کر خود صاحب سلطنت اور حکمراں بن چکے تھے۔

6۔ مغرب کے تازہ بہ تازہ صناعات ہندوستانیوں کے فکر ونظر کو متاثر کر رہے تھے۔

7۔ جدّت کے نام پر مادیت کو فروغ دیا جا رہا تھا۔

8۔ قدامت کے پردے میں ایمانیت تک کو ہدف ملامت بنایا جا رہا تھا۔

9۔ خود غالب فرنگیوں سے بہت متاثر تھے، ان سے روابط رکھتے تھے۔

10۔ ان کی شان میں قصائد کہتے تھے، ان کے درباروں میں شرکت کرتے تھے۔

11۔ جدید ایجادات (ماچس، ریل، گراموفون) کو داد وستائش کا منظوم خراج پیش کر چکے تھے۔

12۔ اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔وغیرہ۔

حکیم محمود احمد صاحب کے مضمون میں صرف غالب کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔انھوں نے غالب کے مختلف اشعار کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غالب کے اشعار میں کیموس ،روح نباتی ،قوت نامیہ،عرق بید، جزواعظم،نسخہ مرہم ،زخم ،لہو، تیمار دار، مسہل ،تبرید،اخلاط فاسدہ وغیرہ طبی اصطلاحات والفاظ ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ غالب طبیب نہ تھے،لیکن ان کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں طب کی شد بد ضرور تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غالب کو طب یونانی کے حوالے سے اچھی معلومات تھی تو شاید بے جا نہ ہوگا۔اسی لیے ہم ان کے خطوط میں دیکھتے ہیں کہ وہ کثرت سے نہ صرف طب یونانی کی اصطلاحات کا ذکر کرتے ہیں، بلکہ اکثر مواقع پر طریقۂ علاج پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔چنانچہ ان کے خطوط میں بکثرت طبی حوالے موجود ہیں۔ غالب کی رائے حکماء،ڈاکٹر اور بید سے متعلق کیا تھی، اس کا اندازہ بھی ان خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔مثلاً نواب علاؤالدین خاں علائی کے نام خطوط میں مختلف حکیموں کے نام گنوائے ہیں:

> ”نظری میں یکتا حکیم امام الدین خاں ،وہ ٹونک۔عملی میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں،وہ کرولی رہے۔ حکیم محمود خاں وہ ہمسایۂ دیوار بہ دیوار، حکیم غلام نجف خاں ،وہ دوستِ قدیم ،صادق الولا؛حکیم بقا کے خاندان میں دوصاحب موجود، تیسرے حکیم منجھلے (حکیم حسام الدین) وہ بھی شریک ہوجائیں گے ۔اب آپ فرمایئے حکیم کون ہے؟ ہاں دوایک ڈاکٹر، بہ اعتبار ہم قومی حکام نامور، یا کوئی ایک آدھ بید، سومنزوی اور گمنام۔“ (ص ۳۸۲، غالب کے خطوط مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، 2000)

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ غالب کے زمانے میں حکماء کا اثر ورسوخ بہ نسبت ڈاکٹر اور بید کے زیادہ تھا۔طب یونانی میں لوگوں کا یقین تھا۔غالباً 1857 کی تباہی کے بعد دہلی سے نامور حکیم اور بید گمنام یا گوشہ نشیں ہوگئے تھے۔

نواب امین الدین خاں ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو ان کا علاج دہلی میں حکماء کے ذریعے ہورہا تھا اور طب یونانی کی مختلف دوائیں ان کے لیے تیار کی گئی تھیں۔علائی کو پریشانی لاحق تھی کہ

میرے والد کا علاج بہتر جگہ ہو جائے، اس لیے غالب سے بار بار اصرار کر رہے تھے کہ کسی بہتر حکیم کو دکھا دیں۔ غالب، امین الدین خاں کے علاج سے متعلق علائی کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے، یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے، سو اس کے موافق حبوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آکر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے گا''۔
> (ایضاً ص ۳۸۳)

غالب نے میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں علم نجوم، منطق، فلسفہ وغیرہ کے ساتھ طب کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ خط کا وہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''میاں کس قصے میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب ونجوم وہیئت ومنطق، فلسفہ پڑھ، جو آدمی بنا چاہے۔'' (ایضاً ص ۵۲۸)

غالب کے خطوط میں طبِ یونانی کی بہت ساری دواؤں کے نام بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ شربت نیلوفر (مذکر، ایک قسم کے نیلے رنگ کے پھول کا نام جو عموماً دواؤں میں استعمال ہوتا ہے)، شربت بنفشہ (مذکر، ایک بوٹی کا نام ہے)، عرق نعناع (مذکر، پودینہ وہ دیسی کشید کیا ہوا سرکہ جو پودینہ کی لاگ سے کھینچا جاتا ہے)، عرق کاسنی (کاسنی ایک دوا کا نام ہے)، عرق بادیان (مؤنث، سونف کا عرق)۔

مذکورہ بالا گفتگو کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم غالب کے خطوط میں شامل طبی عناصر/اصطلاحات کے تعلق سے باتیں کریں۔ اس مقالے کو لکھنے کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔

1۔ ماء الجبن: یہ لفظ مذکر ہے۔ صاحب نور اللغات نے اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے ''وہ سفیدی (یا پانی) جو دودھ کو پھاڑ کر نکالتے ہیں۔ مزید لکھا ہے کہ وہ پانی جو بکری کے دودھ کو پھاڑ کر سفیدی جدا کرنے کے بعد رہ جاتا ہے۔ ماء الجبن مختلف مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چند مندرجہ ذیل اقتباس سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ غالب نے اپنے چہیتے شاگرد منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کی صحت کے تعلق سے لکھا ہے، جس میں ایک طبی

حوالے کے ضمن میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو ماء الجبن سے بھی نہ گیا؟ ایک نسخہ طب محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سود مند ہے مگر اس کا اثر دیر میں ظاہر ہوتا ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اس کو جوش کریں، اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اس باقی پانی کو چھان کر، کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جاوے، اس کو پیئیں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی دن رات، جب پیاس لگے یہی پیئیں۔ تبرید کی حاجت پڑے، اسی پانی میں پیئیں۔ روز جوش کروا کر، چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اس کا فائدہ معلوم ہوگا۔'' (ایضاً ص ۲۳۷)

اس خط کے مطالعے سے طب یونانی سے متعلق غالب کی معلومات کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس حد تک وہ اسے ضروری اور کارآمد سمجھتے تھے۔ انھیں طب یونانی پر پورا یقین تھا، اس کے علاوہ ان کے تجربات و مشاہدات کا اندازہ بھی مذکورہ خط سے ہوتا ہے۔

2۔ تنقیہ: (مذکر، جلاب لینا، صاف کرنا، آنتوں کو صاف کرنا)

تنقیہ کا ذکر نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں ہوا ہے۔ جس میں غالب نے نواب امین الدین خاں (جو علائی کے والد تھے) کی بیماری کے تعلق سے بعض حکما اور ڈاکٹر وغیرہ کا ذکر کیا ہے، اسی ضمن میں لفظ ''تنقیہ'' کا ذکر آ گیا ہے۔ غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

''تنقیہ بہ قے فوراً اور بہ اسہال بعد چند روز عمل میں آیا... کوئی طبیب سوائے تنقیے کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقیے میں سوائے مخرجات بلغم اور کچھ تجویز نہ کرے گا۔ تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیۂ خاص ہو۔'' (ایضاً ص ۳۸۲)

علائی کے نام دوسرے خط میں غالب لکھتے ہیں:

''چونکہ حبوب میں مکرّب دوائیں تھیں۔ بہت بے چین رہے آٹھ دس دست آئے۔ آخر روز مزاج بحال ہو گیا۔ تنقیہ اچھا

ہوا۔" (ایضاً ص ۳۸۵)

نواب انورالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفق کے نام غالب کے ایک خط میں لفظ تنقیہ کا استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"اگر صرف تبرید و تعدیل سے کام نکل جائے تو کیا کہنا، ورنہ بہ حسب رائے طبیب تنقیہ کر ڈالیے۔" (ایضاً ص ۹۸۱)

لفظ "تنقیہ" کا ذکر غالب نے منشی بنی بخش حقیر کے نام بھی ایک خط میں کیا ہے؛ اس میں غالب نے اپنی بیماری کے ضمن میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے:

"حکیم احسن اللہ خاں صاحب سے ربط بڑھ گیا اور اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اور یہ بھی پایۂ علم و عمل میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ اس واسطے انھی کی رائے کے مطابق تنقیہ کیا گیا۔" (ایضاً ص ۱۱۲۰)

حقیر کو ہی دوسرے خط میں لکھتے ہیں اور وہاں بھی اپنی بیماری کا ذکر کیا ہے:

"بات یہی ہے کہ ان امراض کا علاج منحصر کثرت تنقیہ میں ہے اور اس کو حضورِ طبیب و فراغِ خاطر شرط ہے۔" (ایضاً ص ۱۱۵۶)

ان خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے زمانے میں آنتوں کو صاف کرنے کے لیے تنقیہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔

3۔ مسہل: (مذکر، اسہال لانے والا، دست آور دوا، وہ دوا جس سے دست آئے۔ مرکبات میں اس کا استعمال مسہل دینا (یعنی جلاب دینا، دست آور دوا استعمال کرانا) اور مسہل لینا (یعنی جلاب لینا، دست آور دوا کھانا)

عہد غالب میں علاج کا طریقہ دور حاضر سے مختلف تھا، اس دور میں مسہل عام طور پر لیا جاتا تھا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بغیر کسی بیماری کے یوں ہی مسہل لیا جاتا۔ ایسا اتفاق غالب کے ساتھ بھی ہوا۔ انھوں نے بغیر بیماری کے مسہل لیا تو اس کی اطلاع تفتہ کو ان الفاظ میں دیتے ہیں:

"میں مسہل میں ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں، حفظ صحت کے

واسطے مسہل لیا ہے۔'' (ایضاً ص ۲۶۶)

مسہل کی اصطلاح غالب کے خطوط میں بے شمار جگہ آئی ہے۔ مذکورہ بالا خط سے معلوم ہوا کہ مسہل دو وجہ سے لیا جاتا تھا۔ ایک تو بیماری کی وجہ سے، دوسرے حفظ صحت کے واسطے۔ علاج کا جو طریقہ اس دور میں رائج تھا، آج وہ دیکھنے کو نہیں ملتا مثلاً جونکیں لگوائی جاتی تھیں اور اس سے فاسد خون باہر نکالا جاتا تھا، ساتھ ہی دست آور دوا بھی استعمال کرائی جاتی تھی، تاکہ معدے کا فساد باہر نکل جائے۔ ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے علاج کے لیے دلی آئے ہوئے تھے اور انھیں بھی غالباً خون کی ہی کوئی بیماری تھی۔ غالب تفتہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں، جس میں لفظ مسہل کا بھی ذکر ہوا ہے:

''پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے، ابھی یہیں رہے گے، بیمار ہیں... فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے۔'' (ایضاً ص ۳۴۶)

علائی کو ان کے والد نواب صاحب کے مسہل کی اطلاع دیتے ہوئے غالب لکھتے ہیں۔

''پرسوں تمھارا خط آیا۔ کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا۔ گیارہ بجے وہاں سے آیا۔'' (ایضاً ص ۳۸۴)

غالب نے ایک جگہ اپنے مسہل لینے کا ذکر شفق کے نام خط میں کیا ہے:

''بندہ عرض کر چکا ہے کہ مسہل میں ہوں، چنانچہ کل تیسرا مسہل ہوگا۔'' (ایضاً ص ۹۸۲)

حقیر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حکیم احسن اللہ خاں میرے چارہ گر ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ آمد فصل نو ہے، تو مسہل لے ڈال۔ چنانچہ دس بارہ منضج اور تین مسہل ہوئے۔ تیسرا مسہل تھا آج۔ تبرید پی کر تم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔'' (ایضاً ص ۱۱۱۹)

حقیر کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''مسہل میں نے اس واسطے لیا تھا کہ میرے اعضا میں درد رہتا

تھااور فضول معدے میں جمع ہو گئے تھے۔'' (ایضاً ص ۱۱۲۰)

دوسری جگہ شفق کو لکھتے ہیں:

''ایک فصد، بائیس منضج، چار مسہل، کہاں تک آدمی کو ضعیف نہ کرے۔''
(ایضاً ص ۱۰۰۳)

حقیر کو لکھتے ہیں:

''اب اگر چہ تپ نہ رہی لیکن اور عوارض پیدا ہو گئے۔ چنانچہ کل پانچواں مسہل تھا اور کل پھر ہوگا۔'' (ایضاً ص ۱۱۴۱)

حقیر کو حسین علی خاں کی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

''آج تیرہواں دن ہے کہ حسین علی نے آنکھ نہیں کھولی۔ دن رات تپ اور غفلت اور بے خودی۔ کل بارہویں دن مسہل دیا تھا۔ چار دست آئے''
(ایضاً ص ۱۱۵۴)

ان خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسہل بار بار لیا جاتا تھا اور بلاضرورت بھی لیا جاتا تھا تا کہ معدے کا فساد پوری طرح سے باہر ہو جائے۔

4۔ منضج: (مذکر، وہ دوا جو مواد کو پکادے)، صاحب نوراللغات نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ جس کو اطبا جلاب سے پہلے استعمال کراتے ہیں، جس سے طبیعت نرم ہو جاتی ہے۔

لفظ منضج کا استعمال غالب کے خطوط میں کئی جگہ ہوا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے تا کہ اندازہ ہو کہ غالب کے زمانے میں اس کا استعمال کس طرح ہوتا تھا اور عوام کا یقین کیا تھا، لفظ منضج کے ذیل میں فصد کا بھی ذکر ہوا ہے۔ دونوں اصطلاحات کا ذکر ایک ساتھ کیا جاتا ہے۔

5۔ فصد: (مؤنث، رگ سے خون نکالنا) فصد باسلیق: ایک رگ کا نام جو دل اور جگر سے ہوتی ہوئی ہاتھ میں آتی ہے یعنی انسانی جسم کی ہاتھ کی رگ۔

منضج کے ہی ضمن میں غالب نے فصد اور فصد باسلیق کا ذکر بھی کئی جگہ اپنے خطوط میں کیا ہے ایک دو مثالیں گذشتہ صفحات میں آچکی ہیں بعض یہاں پیش کی جارہی ہیں۔

انورالدولہ شفق کے نام ایک خط میں غالب اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھ کو بھی آج دسواں منضج ہے، پانچ سات دن کے بعد مسہل ہوگا۔''

(ایضاً ص ۹۸۱)

اپنی بیماری کے ہی ضمن میں منشی بنی بخش حقیر کو خط میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ دس بارہ منضج اور تین مسہل ہوئے۔تیسرا مسہل تھا آج۔تبرید پی کرتم کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔'' (ایضاً ص ۱۱۲۰)

دوسری جگہ شفق کو لکھتے ہیں:

''آپ کا بندۂ بے درم خریدہ اچھی طرح ہے۔ایک فصد، بائیس منضج، چار مسہل، کہاں تک آدمی کو ضعیف نہ کرے۔'' (ایضاً ص ۱۰۰۳)

نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط میں غالب نے اپنے متبنیٰ کی بیماری کے تعلق سے لکھا ہے:

''مہینا بھر ہوا کہ نہ تپ اترتی ہے، نہ شانے کا درد جاتا ہے، حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز سے فصد بھی کھلی، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔'' (ایضاً ص ۱۲۳۶)

منشی بنی بخش حقیر کے نام ایک خط میں غالب فصد کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''ان دنوں میں حضور والا حضرت خواجہ صاحب کی درگاہ گئے ہوئے تھے اور احقر العباد بھی ساتھ گیا تھا۔ چنانچہ آپ کا نوازش نامہ جو میرے خط کے جواب میں تھا، وہ میرے آدمیوں نے وہیں درگاہ میں میرے پاس پہنچایا تھا۔فرصت جواب لکھنے کی نہیں ہوئی۔چار دن ہوئے کہ میں درگاہ سے شہر میں آیا۔آتے ہی میں نے فصد کھلوائی۔'' (ایضاً ص ۱۰۹۴)

خلیق انجم کے مطابق خواجہ صاحب سے مراد حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہیں۔حقیر کو دوسرے خط میں فصد باسلیق کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:

''مجھ کو بھی بہ سبب فصل بہار کے ہیجان خون ہے۔احتراق کے شدائد بہ نسبت اور دنوں کے زیادہ ہیں۔لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل لیتا مگر کچھ نہ کرسکا۔صرف فصد باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔'' (ایضاً ص ۱۰۹۵)

جیسا کہ گذشتہ مثالوں میں یہ ذکر ہوا ہے کہ فاسد خون باہر نکالنے کے لیے فصد کھلوائی جاتی تھی اور بعض دوسری چیزیں مثلاً جونکیں لگوائی جاتی تھیں تاکہ فاسد خون باہر نکالا جاسکے۔

جونکیں لگنے کا ذکر غالب، علائی کے نام خط میں بھی ایک جگہ کر چکے ہیں۔علی حسین خاں غالب کے عزیز ہیں ان کے پاؤں کی تکلیف سے غالب کو تشویش ہے کہ اب کیا حال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کے پاؤں کا حال مفصل تم کو معلوم ہوگا، جونکیں لگیں، کیا ہوا، کہاں تک نوبت پہنچی۔'' (ایضاً ص ۴۰۶)

6۔ احتراق: (مذکر، گرمی کی شدت، سوزش، جلن)، صاحب نوراللغات نے اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حرارت کے سبب سے کسی خلط کے اجزائے لطیف ا ور رقیق فانی ہو جائیں اور باقی اس طرح کثیف ہو جائیں کہ وہ خلط اپنی جنس سے خارج ہو نہ یہ کہ جل کر خاکستر ہو جائے اور جو خلط محترق ہوتی ہے وہ سودائے غیر طبعی ہو جاتا ہے۔

طب کی یہ اصطلاح شفق کے نام ایک خط میں آئی ہے۔غالب اپنی بیماری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پُر کدورت یعنی احتراق کا مرض۔مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ بارہ تیرہ پھائے اور پاؤ بھر مرہم درکار۔'' (ایضاً ص ۱۰۰۱)

''احتراق'' کا ذکر حقیر کے نام بھی ایک خط میں آیا ہے۔ملاحظہ ہو:

''یہ کافر احتراق کی بیماری جس رنگ سے ظہور کرے، زائل ہونا نہیں جانتی۔تخفیف اس میں بمنزلہٗ صحت ہے۔'' (ایضاً ص ۱۱۴۱)

اسی بیماری کا ذکر غالب نے حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام خط میں بھی کیا ہے:

''تین برس عوارضِ احتراقِ خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی۔'' (ایضاً ص ۱۰۳۰)

دوسری جگہ احتراق کا ذکر حقیر کے نام خط میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں سب طرح خیر و عافیت ہے، مخدوم زادہ بھی تندرست ہوتا چلا ہے۔میں بدستور احتراق کی بلا میں مبتلا ہوں۔'' (ایضاً ص ۱۱۰۴)

انھی کے نام دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''احتراق میں مر رہا ہوں، مگر آموں کو تاکتا ہوں کہ کب نکلیں۔'' (ایضاً ص ۱۱۴۲)

انھی کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''میرا اور آپ کا لہو ملتا ہے۔ جب وہاں احتراق کی شدتیں ہیں تو یہاں اس کا ظہور کیوں کر نہ ہو۔'' (ایضاً ص ۱۰۹۱)

7۔ تپ محرق: (مؤنث، میعادی بخار (تپ دق)

نواب کلب علی خاں بہادر کے نام ایک خط میں غالب نے اپنے فرزند (متبنیٰ) کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ناگاہ تپ محرق نے اسے گھیرا اور شانے کا درد علاوہ۔ مہینا بھر ہوا نہ تپ اترتی ہے، نہ شانے کا درد جاتا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۲۳۶)

8۔ تپ لرزہ: (وہ بخار جو لرزے کے ساتھ ہو)

غالب نے اپنے عزیز شاگرد مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط میں اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جواب نہ لکھنے کی دو وجہ ہے:

''ایک تو یہ کہ میں بیمار، چار مہینے سے تپ لرزہ میں گرفتار۔ دم لینے کی طاقت نہیں، خط لکھنا کیسا۔'' (ایضاً ص ۲۶۴)

9۔ حقنہ: (مذکر، کسی دوا کی بتی یا پچکاری پائخانے کے مقام میں چڑھانا تا کہ پاخانہ آجائے، پچکاری، شیافہ، کسی دوا کی بتی یا پچکاری جو پاخانہ آنے کے واسطے دی جائے۔

غالب نے اپنے فرزند (متبنیٰ) حسین علی خاں کی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے منشی بنی حقیر کو خط لکھا ہے، جس میں حقنہ کا لفظ آیا ہے جو ایک طبی اصطلاح ہے۔ غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

''حسین علی کا حال اگلے خط میں لکھ چکا ہوں۔ آج سولھواں دن ہے تپ کو، اور نواں دن ہے کہ دانا نہیں کھایا، سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے، آج حقنہ ہو رہا ہے، مجھ میں دیکھنے کی تاب نہیں۔ میں دیوان خانے میں بیٹھا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محل میں مردانہ ہے۔ بادشاہی خاص تراش حقنہ کر رہا ہے۔ دیکھیے کیا ہو، مجھ کو تو یاس ہے۔'' (ایضاً ص ۱۱۵۵)

10۔ فمِ معدہ: (مذکر، معدے کا منہ)

11۔ صلابت: (مؤنث، معدے میں صلابت، معدے میں سختی، مضبوطی، سختی جو معدہ یا جگر کے مقام پر ہوتی ہے۔

12۔ ریگ: (مؤنث، پیشاب میں ریگ، بالو، ریت، سراب، وہ ریگ جو گردہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔

غالب نے اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش کو اپنے فرزند کی بیماری کا حال رقم کرتے ہوئے طب سے متعلق بعض اصطلاحات رعناصر کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

فمِ معدہ، صلابت اور ریگ وغیرہ۔ غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

''حسین علی اب اچھا ہے، یعنی تپ نہیں، پیشاب میں ریگ آتی ہے،
معدے میں صلابت ہے، ضعف کی کچھ حد نہیں، خدا کرے بچ جائے۔
اور بالکل اچھا ہو جائے۔'' (ایضاً ص ۱۱۵۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''حسین علی اچھا ہو گیا۔ مگر صلابت معدہ اور فم معدہ کی، ہاں ورم باقی ہے،
کئی دن کے بعد کل پھر تپ چڑھ آئی۔'' (ایضاً ص ۱۱۵۶)

13۔ قولنج: (وہ درد جو پسلی کے نیچے ہوتا ہے)

مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام خط میں غالب نے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے بیماری اور علاج کی تفصیلات لکھی ہیں، جس میں قولنج کا استعمال ہوا ہے، غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

''وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ
رہی، قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر
عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا... گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارے کا
افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے خوف مرگ گیا ہے۔'' (ایضاً ص ۲۷۵)

نواب میر غلام بابا خان کے نام ایک خط میں بھی غالب نے اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے قولنج کا استعمال کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

''گھنٹہ بھر میں دو بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے، اگر ایک ہفتے دو ہفتے
کے بعد ناگاہ قولنج دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں حالت
جان میں نہیں۔'' (ایضاً ص ۱۰۰۸)

نواب رام پور یوسف علی خاں ناظم کو بھی اسی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دعا گو ایک مہینہ بھر سے بیمار ہے۔ ابتدا وہی قولنج دورے، بہ سبب استعمال ادویۂ حارّہ کہ اس مرض میں اس سے گریز نہیں۔'' (ایضاً ص ۱۱۹۵)

مذکورہ بالا خط میں ایک دوا حارّہ کا ذکر ہوا ہے۔لفظ حارّ حرارت رکھنے والا یا گرم رکھنے والی دوا کا نام ہے۔حقیر کے نام ایک خط میں بھی اسی بیماری کا ذکر ہے۔غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

''میرے وجع الصدر کی اتنی فکر نہ چاہیے۔میرے امراض بیشتر دورے ہیں۔ آگے ایک قولنج کا دورہ تھا اب وجع الصدر کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔جب یہ درد اٹھ کھڑا ہوتا ہے، چار پہر، چھ پہر، دو پہر رہتا ہے، پھر رفع ہو جاتا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۱۱۹)

وجع الصدر سے مراد سینہ کا درد ہے جس سے غالب دوچار تھے۔

14۔ رَعشہ: (مذکر، کپکپی، لرزہ، تھرتھراہٹ)، ایک بیماری جس میں خود بخود ہاتھ وغیرہ کانپتے ہیں۔

نواب میر غلام بابا خاں کے نام ایک خط میں غالب نے اپنی بیماری کے ضمن میں لفظ'' رعشہ'' کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی۔ہاتھ میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی ضعیف ہو گئی۔'' (ایضاً ص ۱۰۱۱)

اسی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے حکیم سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

''ضعف نہایت کو پہنچ گیا، رعشہ پیدا ہو گیا، بینائی میں بڑا فتور پڑا۔'' (ایضاً ص ۱۰۳۲)

نواب کلب علی خاں بہادر نواب رام پور کے نام ایک خط میں بھی اسی بیماری کا ذکر ہے۔غالب لکھتے ہیں:

''خاطر اقدس میں نہ گزرے کہ غالب تعمیلِ احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں فتور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل۔ناچار کاتب کی تلاش کی۔

شہر سراسر ویران ہے۔" (ایضاً ص ۱۲۳۲)
انھی کے نام خط میں ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

"اس درویش کا حال اب قابل گزارش نہیں ۔ امراض قدیم بڑھ گئے ۔دوران سر اور رعشہ اور ضعف بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔" (ایضاً ص ۱۲۴۳)

15۔ صداعِ شدید: (مذکر، شدت کا سر درد، دردِ سر)
اس اصطلاحِ طبی کا ذکر منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں ہوا ہے۔ غالب اپنی بیماری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آخر کار تپ چڑھی اور صداع شدید عارض ہوا...تپ جو عارضی تھی، جاتی رہی مگر صداع شاید مادی اور بجائے خود ایک مرض حقیقی تھا کہ ہنوز باقی ہے۔" (ایضاً ص ۱۰۹۱)

گذشتہ اوراق میں تنقیہ کے ضمن میں ایک طبی اصطلاح تبرید و تعدیل کا ذکر ہوا ہے۔

16۔ تبرید: (مؤنث، ٹھنڈی دوا، وہ دوا یا شربت جو مسہل کے بعد اس کی حرارت کو دور کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ صاحب نور اللغات نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ شربت یا دوا جو تپ کے اول تین دن اور مسہل کے بعد اس کی حرارت کے انطفا کرنے اور دل کو تقویت دینے کے واسطے دی جاتی ہے۔

17۔ جدوار: (مؤنث، دافعِ زہر بوٹی، زہر دور کرنے والی جڑ)
منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب نے ایک خط میں ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کی بیماری کے تعلق سے لکھا ہے، جس میں جدوار کا ذکر ہوا ہے۔ غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

"منشی عبداللطیف کا حال معلوم ہوا۔ خدا پر نظر رکھو اور تقویت کی رعایت کیے جاؤ۔ لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں کہ جدوار بہت مفید ہوگی۔ اگر وہاں اچھی نہ ملے تو مجھ کو لکھ بھیجو، میں یہاں سے بھیج دوں۔" (ایضاً ص ۱۱۵۹)

نواب کلب علی خاں کے نام خط میں بھی جدوار کا ذکر ہوا ہے، غالب لکھتے ہیں:

"اب آپ کو حفظ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی و جدوار کا استعمال ضرور ہے" (ایضاً ص ۱۲۱۸)

18۔ ماءاللحم: (مذکر، گوشت کا عرق (پانی) جو کشید کر کے نکالا جائے)
حکیم غلام نجف خاں کے نام خط میں غالب نے ایک نسخۂ ماءاللحم کا ذکر کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

''ظہیرالدین کی دادی کا بہ عارضۂ سرفہ وسعال رنجور ہونا...
اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی
ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماءاللحم کا ہے، وہ کھچوادو اور ذرا خبر
لیتے رہو۔'' (ایضاً ص ۶۳۶)

نواب کلب علی خاں کے خط میں ان کی بیماری اور مختلف طب یونانی کے ذیل میں ماء اللحم کا ذکر آیا ہے۔ غالب نے متعدد ادویہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کثیرالاجزا اور معجونین ہیں مفرحِ بوعلی سینا، خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاؤ
زبانِ عنبری، ماءاللحم غیر منشی، جس میں طیور کے گوشت اور ادویۂ مفرح
ومقوی حرارت وبرودت میں معتدل۔'' (ایضاً ص ۱۲۱۸)

19۔ زہرمہرہ: (مذکر، ایک قسم کا پتھر جو زہر جذب کر لیتا ہے)
منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں ان کے صاحب زادے منشی عبداللطیف کی بیماری کے ضمن میں غالب نے لکھا ہے:

''حال منشی عبداللطیف اور ذکیہ معلوم ہوا۔ گرمی کا موسم ہے۔ میں
جانتا ہوں ان دونوں کو زہرمہرہ کا استعمال مفید ہوگا۔ کبھی کبھی شربت نیلو
فر میں گھس کر پلا دیا کریں اور چاٹ لیا کریں۔'' (ایضاً ص ۱۰۹۷)

انھی کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''واسطے خدا کے اب کول آگئے ہو، وہ عرق شروع کرو، جس طرح عرض کیا
گیا، کبھی شربت نیلوفر کے ساتھ اور کبھی شربت مرکب کے ساتھ۔ بندۂ
خدا ایک پچاس دن میرا کہا مانو اور اس عرق کو پیو۔'' (ایضاً ص ۱۱۰۰)

20۔ رُعاف: رُعاف کا ذکر منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں ہوا ہے۔ غالب زین العابدین خاں عارف کی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے حقیر کو لکھتے ہیں:

''کیا پوچھتے ہو زین العابدین خاں کا حال اور کیا کہوں اس کی بی بی کا

حال۔ پہلے اس کی حقیقت سنو۔ بھائی اس کو ناگاہ رُعاف ہوا۔رُعاف
میں ناک سے لہو آتا ہے مگر اس کو منہ سے لہو آیا، ناک سے تھوڑا تھوڑا اور
منہ کا کیا حال تھا گویا مشک کا دہانہ کھول دیا ہے۔ایک ہفتے میں خدا جھوٹ
نہ بلوائے آٹھ دس سیر خون نکلا، سیاہ اور بدبودار۔'' (ایضاً ص ۱۱۰۰)

یہاں بو کی شدت بیان کرنے کے لیے غالب نے مشک کا لفظ استعمال کیا ہے، کیونکہ مشک کی بو بہت شدید ہوتی ہے۔ البتہ مشک خوشبودار ہوتا ہے اور حالت رعاف میں جو خون نکلتا ہے وہ بدبودار، یہاں مشک اور رعاف کی وجہ سے نکلنے والے خون میں حداشتراک صرف بو کی شدت ہے۔

مذکورہ بالا طبی اصطلاحات/عناصر کے علاوہ غالب کے خطوط میں بہت ساری دواؤں کا ذکر بھی ہوا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام یہاں درج کر دیے جائیں۔

منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں غالب نے دست سے متعلق دواؤں کے ذ
کر کے ساتھ ایک نسخہ تجویز
کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سنا میں نے کہ پھر اس کو دست آنے لگے۔صاحب اندیشہ نہ کرو۔جوں
جوں یہ بڑھتا جائے گا اور حرارت اس کے مزاج میں آتی جائے گی، ووں
ووں یہ حالت رفع ہوتی جائے گی۔انشاء اللہ تعالیٰ۔اصل خیری، جوارش
عود و جوارش مصطگی رکھو۔ نہ ہر روز بلکہ گاہِ گاہِ اس کو چٹا دیا کرو اور
خورشہائے ناگوار مت دیا کرو۔'' (ایضاً ص ۱۰۹۳)

منشی نبی بخش حقیر کے ہی نام خط میں طب یونانی کی مختلف دواؤں کا ذکر کیا ہے:

''میں جانتا ہوں ان دونوں کو زہر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا۔کبھی کبھی
شربت نیلوفر میں گھس کر پلا دیا کریں اور چاٹ لیا کریں۔بھائی لڑکوں کا
گھر ہے۔شربت نیلوفر، شربت بنفشہ، عرق نعناع کی سکنجبین، عرق کاسنی،
عرق بادیان، اس طرح کی چیزیں گھر میں تیار کرو۔گاہِ گاہِ استعمال میں
آتی رہیں۔'' (ایضاً ص ۱۰۹۷)

حقیر کو ایک جگہ دوسرا نسخہ تجویز کیا ہے اور لکھتے ہیں:

''منشی عبداللطیف کا ضعفِ دل و دماغ گویا خلقی ہے، اس کی فکر زیادہ نہ کرو۔ نوشدارو خمیرہ گاؤ زبان، خمیرۂ ابریشم۔ دواء المسک۔ اس طرح کے مرکبات کا استعمال چلا جائے۔ نہ علی الدّوام بلکہ گاہ گاہ۔'' (ایضاً ص ۱۱۵۷)

غالب نے اپنے ایک خط میں نیم کی پتی کا ذکر بھی طبی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ حقیر کو ہی نیم کی پتی کا ایک نسخہ بتائے ہوئے لکھتے ہیں:

''نیم کی پتیاں تم پیتے ہو، خوب کرتے ہو، یہ کہ اس کو کھا کر ایک بیسن کی ٹکیا گھی ڈال کر کھاتے ہو، یہ ترکیب عامیانہ ہے۔ ہاں یہ مسلم کہ چنے کی روٹی ان امراض میں اگر غذا منحصر اسی پر کی جائے اور ایک مدت تک یہ طریق نبھ جائے تو بہت نافع ہے۔ میں ایک بات تمھیں اور بتاتا ہوں۔ تم نیم کی مستی پیا کرو۔ یعنی بعضا نیم رستا ہے اور اس میں سے ایک رطوبت نکل کر جم جاتی ہے، اسے نیم کی مستی کہتے ہیں۔ سبیل اس کی یہی ہے کہ دو پیسے بھر سے شروع کرو اور پانچ ماشے بڑھاتے جاؤ۔ جب پانچ تولہ پر آ جاؤ تو تھم جاؤ۔ بھلا زیادہ نہیں تو بیس دن تو پانچ پانچ پیسا بھر پیو۔ پرہیز بدستور۔ بیشتر چنے کی روٹی کھایا کرو۔ دوا پی کر ٹکیا کھانی زائد ہے۔ چنے کی روٹی کے ساتھ وقت غذا کے گھی بہ قدر برداشت طبع کھاؤ۔ گھیا، توری، خرفے کا ساگ، بھتوے کا ساگ، کھیرا، ککڑی، جس کا قلیہ مرغوب ہو، کھاؤ۔ دیکھو تو یہ ترکیب موافق آتی ہے یا نہیں۔'' (ایضاً ص ۱۱۲۱)

غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے نام خط میں بیماری اور روگ کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ جو تپ اور کھانسی مزمن ہو جاتی ہے تو یہ بیماری نہیں ہے، روگ ہے۔ اس طرح کے مریض برسوں جیتے ہیں اور اگر قسمت میں ہوتا ہے تو اچھے بھی ہو جاتے ہیں۔ کلثوم کو ماں کا دودھ نہ پلواؤ، دائی رکھ لو۔ مریضہ کو بھی افاقت رہے گی اور لڑکی بھی راحت پائے گی۔'' (ایضاً ص ۱۱۵۳)

اس خط میں بیماری اور روگ ایک طبی اصطلاح کا ذکر ہوا ہے اور غالب نے واضح کیا

ہے کہ بیماری جب پرانی ہو جاتی ہے تو روگ بن جاتی ہے اس کے علاوہ اس خط میں غالب کے بعض دوسرے طبی تجربات کا علم ہوتا ہے۔

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا ہے کہ غالب طبیب نہ تھے لیکن طب یونانی کا بھرپور تجربہ رکھتے تھے، جس کا اندازہ مذکورہ بالا خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ غالب نے خود ایک جگہ نواب کلب علی خاں بہادر کے نام خط میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ضمناً ایک نسخے کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

> ''بعد تسلیم معروض ہے، میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں، ستر برس کا آدمی ہوشیار رہوں۔ اور سے یہ کہا نہیں جاتا۔ حضرت پر بغیر ظاہر کیے رہا نہیں جاتا۔ خدا جانے اور طبیب کیا سمجھتے ہوں گے کہ کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اشتراک معدہ وقلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی وجدوار کا استعمال ضرور ہے۔ اور معجون طلائی عنبری تقویت قلب میں مجوزہ حکیم ببر علی خاں مغفور ہے۔ ورق طلا، عنبراشہب، عرق کیوڑہ، قند۔ کثرت اجزا اس ترکیب خاص میں ناپسند۔'' (ایضاً ص ۱۲۱۸)

مذکورہ بالا خط کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب طبیب نہ ہونے کے باوجود طب یونانی میں کس قدر عمل دخل رکھتے تھے۔ ضمناً بہت ساری دواؤں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایک نسخہ بھی نواب کلب علی خاں کو تجویز کیا ہے۔

اس تفصیلی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ غالب کے خطوط صرف خیر و عافیت دریافت کرنے یا اپنی خیریت سے مکتوب الیہ کو باخبر کرنے کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ ان میں مختلف علوم وفنون کا ایک سمندر موجزن ہے۔ خطوط ایک طرح سے کسی انسانی ذہن کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں، ساتھ ہی ان میں معاشرے میں رائج بعض ایسی باتوں کا بھی ذکر ہوتا ہے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا اہم باب ہو جاتا ہے۔ غالب کے خطوط میں طب یونانی کا ذکر دراصل اسی تاریخی اور رائج طریقہ علاج کا ایک اہم حصہ ہے۔

غالب کے خطوط کے مطالعے سے بہت سارے گوشے وا ہوتے ہیں، بعض کا ذکر راقم التحریر اپنی تمہیدی گفتگو میں کر چکا ہے۔ ان کے خطوط کا ایک اہم پہلو طب قدیم یا طب یونانی بھی

ہے، جس پر اس مقالے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے، کہ غالب کے خطوط میں طبی عناصر، اصطلاحات کے علاوہ جابجا طبی حوالے ملتے ہیں اور بہت ساری یونانی ادویات، جڑی بوٹیوں اور گھریلو نسخوں کا علم بھی ہوتا ہے۔ غالب کے زمانے میں عوام کا اعتماد اور خود غالب کا یقین طب یونانی اور حکماء پر زیادہ تھا۔ اس عہد میں حکماء کا اثر و رسوخ بہ نسبت ڈاکٹرز اور بید کے زیادہ تھا، لوگ علاج و معالجے کے سلسلے میں حکماء کی طرف رجوع کرتے تھے۔

امید ہے کہ اس گفتگو سے غالب کے خطوط کو از سر نو دریافت کرنے اور سمجھنے میں مدد ملے گی اور مزید پہلو نکل کر سامنے آئیں گے۔ راقم الحروف کی معلومات میں اب تک خطوط غالب کا اس حوالے سے مطالعہ سامنے نہیں آیا ہے، اس لیے اسے ابتدائی کوشش سے تعبیر کیا جانا چاہیے، کوشش ہی کسی بڑے کام کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

O

شاہ نواز فیاض

مطالعۂ غالب اور گیان چند جین

اردو شاعری میں غالب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پچھلی ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے سے غالب کے افکار وخیالات پر محققین وناقدین اپنی تحقیقات ومعروضات پیش کررہے ہیں، بے شمار کتابیں اور مقالے لکھے جاچکے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ سندی تحقیق کے لیے بھی بے شمار تحریریں معرض وجود میں آئیں۔ مولانا الطاف حسین حالی کی 'یادگار غالب' سے غالب شناسی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ہنوز جاری ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود غالب سے متعلق غور و فکر کے ابھی بہت سے گوشے ایسے ہیں، جو تشنہ ہیں۔ اس عرصے میں جو ادبی وتحقیقی کام ہوئے وقتاً فوقتاً ان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ادبی وتحقیقی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے غالب کے ناقدین ،محققین اور شارحین کی خدمات کے بھی جائزہ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے اور اس سلسلے کی بعض اہم پیش رفت بھی ہو چکی ہے۔

کلام غالب اور خطوط غالب کی تدوین وتحقیق متعدد محققین نے کی ہے۔ ان حوالوں سے غالب کی فکری اور فنی جہات پر لکھا بھی خوب گیا۔ نسخۂ دیوان غالب کی دریافت اور الگ الگ نسخوں کے نام سے اس کی اشاعت جیسے، نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ بھوپال، نسخۂ امروہہ، نسخۂ عرشی اور نسخۂ عرشی زادہ وغیرہ۔ اسی طرح غالب کے کلام کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق پچاس سے زائد

شرحیں کلام غالب کی لکھی جا چکی ہیں۔ گیان چند جین نے بھی متعدد تحقیقی اور تنقیدی مقالے لکھے اور 'تفسیر غالب' کے نام سے کلام غالب کی شرح لکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلام غالب کے مدون، محقق و ناقد مالک رام کی خدمات کا 'غالب شناس مالک رام' نامی کتاب میں جائزہ پیش کیا ہے۔ اسی لیے گیان چند جین کو غالب شناس کہا جاتا ہے۔

نسخۂ غالب کی تحقیق کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اختلاف نسخ اور شعر کے متعلق لوگوں کی معروضات اپنی جگہ لیکن اس نسخہ کو دریافت کس نے کیا۔ اس بارے میں اکثر لوگ خاموش ہیں۔ مثلاً نسخۂ حمیدیہ کو مولانا عبدالسلام ندوی نے دریافت کیا تھا۔ اس کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے معارف کے شذرات میں دی تھی لیکن اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> ''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی شعرالہند کی خاطر آجکل کتبخانوں کی خاک چھان رہے ہیں، اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے، وہاں کے کتبخانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا، یعنی مرزا غالب کا مکمل اردو دیوان بلا حذف وانتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے، نہایت عمدہ مطلا نسخہ ہے، کسی خوش مذاق ہاتھ وہ پڑا تھا، اس نے ان غزلوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔''
>
> (معارف، جلد سوم، ستمبر ۱۹۱۸، ص، ۱۱۶)

سید سلیمان ندوی کے مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ پہلے پہل مولانا عبدالسلام ندوی نے دریافت کیا، لیکن اس کو کیا کہیں کہ سید سلیمان ندوی کے مندرجہ بالا جملوں کے علاوہ اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا۔ مفتی محمد انوار الحق نے 'نسخۂ حمیدیہ' کے مقدمے میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جبکہ یہ نسخہ عبدالرحمٰن بجنوری کے ہاتھوں مفتی انوار الحق تک پہنچا تھا۔ مفتی محمد انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ کے متعلق لکھا ہے:

> ''اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیونکر پہنچا۔ لیکن تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوجدار محمد خاں صاحب

کے لیے لکھا گیا تھا۔''

(دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) مفتی محمد انوار الحق۔اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ۔۱۹۸۲ص،۵)

اس کے بعد مفتی انوار الحق نے غالب کے تعلق سے جو کچھ لکھا، وہ خود ایک نئی بحث کا موضوع ثابت ہوا۔اس تعلق سے گیان چند جین نے جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمائیں:

''عرشی صاحب نے حاشیۂ ق اور آخرِ ق کے زمانے کے بارے میں جو فیصلے کیے تھے وہ اس مفروضے پر مبنی تھے کہ یہ سب غالب کے قلم سے ہیں۔اب عرشی صاحب بھی مانتے ہیں کہ بدنما خط کے اضافے کسی اور قلم سے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کا مضمون پڑھنے کے بعد وہ بھی جاننے لگے ہوں گے کہ نستعلیق خط کی اصلاحیں اور اضافے بھی غالب کے قلم سے نہیں۔محض لکھاوٹ سے کاتب کی تعیین، ادبی محقق بھی پورے وثوق سے نہیں کر سکتا...عرشی صاحب نے جب نسخۂ بھوپال کا مطالعہ کیا تو اول تو اس وقت ان کے سامنے غالب کی دوسری تحریریں نہ تھیں کہ مقابلہ کر سکتے، انھیں محض ذہنی تصویروں پر بھروسہ کرنا پڑا دوسرے ان کے ذہن پر مرتبِ نسخۂ حمیدیہ کا یہ فیصلہ حاوی ہوگا کہ پورا حک و اضافہ غالب کے قلم سے ہے۔''

(رموزِ غالب۔گیان چند جین۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔۲۰۱۱۔ص،۲۳)

گیان چند جین نے اختلاف شعر اور نسخ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے 'رموز غالب' نامی کتاب میں شامل کر دیا ہے۔اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ''رموز غالب'' غالب کے کلام بالخصوص منسوخ کلام کے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں غالب کے ابتدائی کلام سے بحث کی گئی ہے۔گیان چند جین نے ان مضامین میں غالب کی شاعری کو فکری وفنی حوالے سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک کا تعلق تحقیق سے ہے جبکہ دوسرے کا تنقید سے۔انھوں نے غالب کے منسوخ کلام کے لیے کئی اصطلاحات اور معروضات بھی پیش کی ہیں۔گیان چند جین نے غالب کو پڑھنے، سمجھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے اس کتاب کے توسط سے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

''رموز غالب'' میں تحقیقی مضامین کی تعداد نو ہے جبکہ تنقیدی مضامین کی تعداد تین

ہے۔اسے پہلی بار مکتبہ جامعہ نے ۱۹۷۶ میں شائع کیا تھا۔ کتاب ۳۴۴صفحات پر مشتمل ہے۔ گیان چند جین کے مطابق انھیں تنقیدی مضامین لکھنے کا شوق نہیں، لیکن تحقیقی مضمون کا مواد ہمیشہ دستیاب نہیں ہوتا اس لیے بعض فرمائشوں کی تکمیل میں تنقیدی یا تنقید آمیز مضامین لکھنے پڑتے ہیں۔اس کتاب میں شامل تمام تحقیقی مضامین کسی کی فرمائش پر نہیں لکھے گئے ہیں، بلکہ گیان چند جین نے از خود لکھا ہے۔اس کتاب میں گیان چند جین نے مضامین کی ترتیب اسی طرح قائم کی ہے:

۱۔ نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے
۲۔ نسخۂ عرشی، طبع ثانی سے متعلق کچھ معروضات
۳۔ نسخۂ عرشی، کچھ اشعار کی قراتیں
۴۔ غالب کا خودنوشت دیوان
۵۔ نسخۂ عرشی زادہ، ایک جائزہ
۶۔ خودنوشت مخطوطۂ غالب اور اس کی اصلاحیں
۷۔ دیوان غالب کا متنازع مخطوطہ
۸۔ دیوان غالب کے متنازع مخطوطات پر مزید مشاہدات
۹۔ ''بیاضِ غالب'' ''ایک تحقیقی جائزہ'' پر ایک نظر

''نسخۂ عرشی'' دراصل امتیاز علی عرشی کا مرتب کردہ دیوان غالب ہے۔ جسے پہلی بار انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹۵۸ میں شائع کیا۔اس دیوان میں متن کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ گنجینۂ معنی: اس میں غالب کا منسوخ کلام ہے۔
۲۔ نوائے سروش: یہ غالب کا متداول کلام ہے۔
۳۔ یادگار نالہ: یہ مختلف مآخذ سے لیا ہوا متفرق کلام ہے۔اس کلام کو نہ غالب نے مسترد کیا تھا اور نہ اپنے مرتبہ دیوان میں ہی شامل کیا تھا۔ جس سے یہ واضح نہیں ہوتا ہے کہ غالب اسے قابل اشاعت سمجھتے تھے یا نہیں۔

نسخۂ عرشی میں ڈیڑھ ہزار سے زائد اشعار کے فقروں اور اجزا میں امتیاز علی عرشی نے فراخ دلی سے اوقاف اور اعراب کا استعمال کیا ہے۔ یقیناً اسی وجہ سے اشعار کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ گیان چند جین کے مطابق غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر نسخۂ عرشی کا

دوسرا ایڈیشن شائع کیے جانے کی خبر ہے۔ لہٰذا گیان چند جین نے اپنا مضمون ''نسخۂ عرشی طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات'' اور ''نسخۂ عرشی: کچھ اشعار کی قراتیں'' اسی ضمن میں لکھا تھا۔ ان مضامین میں نسخۂ عرشی طبع اول کے مطالعہ کے بعد انھوں نے طبع ثانی کے لیے کچھ تجاویز پیش کی تھیں۔ گیان چند جین کا خیال یہ تھا کہ ان تجاویز پر عمل کرنے سے نسخۂ عرشی زیادہ بہتر ہوسکتا ہے۔ گیان چند جین نے آگے لکھا ہے کہ اگر مولانا عرشی ان میں سے کوئی بھی تجویز قبول کرلیں تو میرے لیے باعث عزت ہوگی۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ آخر گیان چند جین نے ایسا کیوں کہا؟ کیا انھیں اپنے معروضات پر یقین نہیں تھا۔ ان کے لیے اتنا ہی ضروری تھا کہ جو کچھ مناسب نہیں سمجھا، اس کا اظہار کردیا۔ اس پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے، یہ تو مصنف، مرتب اور مدون پر ہے کہ وہ کس کے بتائے ہوئے اصول پر یقین کرتا ہے اور کسے قابل اعتنا سمجھتا ہے۔ گیان چند جین کا کام صرف اتنا تھا کہ انھوں نے جو کچھ مناسب سمجھا، لکھ دیا۔ یہی ایک محقق کی ذمہ داری ہے۔ اب اسے کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔ یہ بات بہر حال قابل غور ہے کہ انھوں نے یہ کیوں لکھا کہ ان تجاویز کو اگر عرشی صاحب مان لیں تو ان کے لیے باعث عزت ہوگی۔ لیکن نہ ماننے کی صورت میں کیا ہوگا اس کا اظہار نہیں کیا۔ محقق کا جو کام ہے وہ حق بہ جانب کرے۔ اس کی ذمہ داری یہیں ختم ہوجاتی ہے۔

گیان چند جین نے کلام غالب کے مختلف نسخوں کو بغور پڑھا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے نسخۂ عرشی کے تعلق سے معروضات پیش کی ہیں۔ پہلے ان جملوں کو ملاحظہ فرمائیں، جو انھوں نے نسخۂ عرشی کی خوبی کے طور پر لکھے ہیں، اس کے بعد ان جملوں کو جس کی اصلاح چاہتے ہیں یا جس کی وضاحت مقصود ہے:

> ''آج مجھ جیسے مبتدیانِ غالبیات نسخۂ رامپور جدید، نظامی ایڈیشن کانپور وغیرہ کی اصطلاحوں میں بات چیت کرسکتے ہیں یہ نسخۂ عرشی ہی کا فیضان ہے ورنہ میں نے کب ان نسخوں اور ایڈیشنوں کو دیکھا تھا۔ مقدمے کے علاوہ حواشی اور اختلافِ نسخ اہل تحقیق کی جنت ہیں۔ ان کا مطالعہ جتنی تفصیل سے کیا جائے اتنی ہی لذت اور روشنی ملتی ہے۔ عرشی صاحب نے ایک ہی متن پیش نہیں کیا اختلافِ نسخ کے ذریعے چودہ مخطوطات و مطبوعات کا متن بڑی حد تک فراہم کردیا ہے۔ مجھے نسخۂ عرشی کی خوبیاں گنانے کی ضرورت نہیں۔'' (ایضاً، ص ۳۲)

گیان چند جین نے امتیاز علی عرشی کے کام کی خوب داد دی اور اسے 'اہل تحقیق کی جنت' سے تعبیر کیا۔ لیکن اس مضمون کے لکھنے کا مقصد ان کا کچھ اور تھا۔ وہ مقصد طبع ثانی کے لیے کچھ معروضات پیش کرنا تھا۔ جس میں سے چند کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

''دیباچے میں ایک موضوع کا اضافہ چاہوں گا۔ غالب کے نو دریافت اور الحاقی کلام کی بحث، جزیات تو حواشی کے ذیل میں آجائیں گے لیکن دیباچے میں بھی ان اہم مآخذ کا ذکر کر دینا چاہیے جہاں سے غالب کا متفرق کلام ملا۔ اس سلسلے میں شرح آسی اور بیاض علائی وغیرہ کی تفصیل آجائے گی۔ آسی کی غزلوں اور قادر نامے پر بحث کی جاسکتی ہے۔ کہ اول الذکر کیوں غالب کا کلام نہیں۔ اور ثانی الذکر کے بارے میں سیر حاصل بحث نہیں۔ نادم سیتاپوری نے اپنی کتاب 'غالب کے کلام میں الحاقی عناصر' میں جس کلام کے بارے میں شبہہ کا اظہار کیا ہے اس پر بھی مرتب اظہار رائے کریں۔'' (ایضاً۔ ص،۳۴)

''مقدمے میں مرتب نے دیوان غالب کے ان مخطوطوں اور ایڈیشنوں کی تفصیل دی ہے جن کی بنا پر انھوں نے اپنا نسخہ ترتیب دیا۔ کیا اچھا ہو اگر طبع ثانی میں وہ دیوان کے ایک اہم مخطوطے اور چند اہم ایڈیشنوں کے تعارف کا اضافہ کر دیں ان میں سب سے اہم ۱۲۵۴ھ کا مخطوطہ بدایوں ہے۔ نسخہ عرشی سے اس کے اشعار کا مقابلہ کر کے دیکھا جائے کہ کیا اس میں کچھ ایسے اشعار ہیں جو نسخۂ شیرانی (تلف شدہ اوراق کو چھوڑ کر) میں نہیں... اگر ایسے اشعار کافی تعداد میں ہوں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ متداول کا نقش اول نسخۂ شیرانی سے نہیں لیا گیا۔ بلکہ اس میں اس کے بعد کا کہا ہوا کلام بھی شامل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو سکے گا کہ متداول دیوان کی ترتیب کلکتے میں نہیں ہوئی کیونکہ کلکتے میں غالب کے پاس نسخۂ شیرانی کا مبیضہ ہی تھا۔ نسخۂ رام پور قدیم اور نسخۂ بدایوں کے اشعار کا مقابلہ کر کے بھی درج کیا جائے۔'' (ایضاً۔ ص،۴۱)

''نسخۂ رام (ق) میں نوائے سروش کی غزل ۵ ہے لیکن اس کے آخری چار

شعر نہیں جو نسخۂ بھوپال میں موجود ہیں۔ عرشی صاحب نے اس کی ردیف وار تفصیل دی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ دیوان قدیم کا ایک اور متدوال شعر قب میں سے غیر حاضر ہے۔ قب میں ب کی ردیف میں ١١ شعر ہیں۔ یہ غزل نسخۂ بھوپال، نسخۂ شیرانی اور متداول دیوان میں بھی ملتی ہے۔ اس میں اصلاً ١٢ شعر تھے جو سب کے سے انتخاب میں باقی رہے ہیں۔ اس طرح قب میں نوائے سروش کی دو غزلوں میں اشعار کا نقصان ہے۔'' (ایضاً۔ ص، ٣٥-٣٦)

اس کتاب میں شامل ایک مضمون ''نسخۂ عرشی زادہ ایک جائزہ'' ہے۔ نسخۂ عرشی زادہ مولانا امتیاز علی عرشی کے بیٹے اکبر علی خاں کا مرتب کردہ مخطوطۂ کلام غالب ہے۔ اکبر علی خاں پہلی بار اس نسخے میں عرشی زادہ کے لقب کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ اس کا پیش لفظ آل احمد سرور نے لکھا ہے۔ نسخۂ عرشی زادہ کے تعلق سے گیان چند جین نے لکھا ہے:

''میں نے پچھلے سال تقریباً آدھ گھنٹے کے لیے نسخۂ عرشی زادہ کو سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اب ١٩٧١ میں مجھے اس کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا۔ دیدہ زیبی اور حسن ظاہری کے اعتبار سے یہ جلد مرقع چغتائی اور شاہکار انیس کے زمرے میں جگہ پائے گی لیکن اس کی اہمیت محض اس کے ظاہر کی وجہ سے نہیں، اس کے مشمولات کی وجہ سے ہے۔'' (ایضاً۔ ص، ١١٩)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیان چند نے نسخۂ عرشی زادہ کا مطالعہ کیا۔ مصرعوں کے ناخواندنی قلم زد الفاظ کو پڑھنے میں مرتب نے جس چابکدستی کا ثبوت دیا ہے، اس نے گیان چند جین کو عش عش کرنے پر مجبور کیا۔ یقیناً گیان چند جین اس کے مطالعہ سے بہت متاثر ہوئے۔ جہاں ان کو جو کمی لگی اس کی طرف بھی اشارہ کردیا، تاکہ طبع ثانی کے لیے غور وخوض کیا جاسکے۔

'نسخۂ بھوپال کی اصطلاحیں اور اضافے' میں گیان چند جین نے اپنے معروضات پیش کیے ہیں، جیسے 'ابتدائی اور آخری سادہ اوراق کے مندرجات' اور 'متن میں اصلاحیں اور حاشیے پر اضافہ'۔ ابتدائی اور آخری سادہ اوراق کے مندرجات پر جو لکھا ہے، اس پر بھی انھوں نے بحث کی ہے۔ امتیاز علی عرشی نے اس متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ کیوں کہ عرشی صاحب نے اس کی تفصیل کسی قدر مختلف دی ہے۔ اسی ضمن میں گیان چند جین نے ڈاکٹر

عبداللطیف کے مضمون کا ذکر بھی کیا ہے۔ امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر عبداللطیف کے مطالعے کا فرق یہ بیان کیا گیا ہے کہ امتیاز علی عرشی نے اپنے دو دن کے قیام بھوپال میں نسخۂ بھوپال کا نسخۂ حمیدیہ سے مقابلہ کیا اور مفصل نوٹ بھی لیے، جبکہ ڈاکٹر عبداللطیف نے مخطوطے کو حیدر آباد منگا کر اطمینان سے پڑھا، ان کا یہ مطالعہ دیوان غالب کی تاریخی ترتیب کے نقطۂ نظر سے تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر عبداللطیف کے بیان کو عرشی صاحب کے بیان پر ترجیح دینا حق بہ جانب ہوگا۔ اس ضمن میں قاضی عبدالودود کا مضمون 'دیوان غالب کے دو نسخے' بھی قابل غور ہے۔ جہاں انھوں نے نسخۂ شیرانی اور نسخہ عرشی میں بعض غزلوں کی تعداد میں بھی فرق کو ظاہر کیا ہے۔ مثلاً:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں؟ لیکن
کبھی زمانہ مرادِ دل خراب تو دے

میں نسخۂ شیرانی میں آٹھ اشعار ہیں، جبکہ نسخۂ عرشی میں یہ چھ شعر کی غزل۔ اس پورے مضمون میں اسی طرح کے باریک حصے کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون لکھتے وقت گیان چند جین کے پیش نظر کتنے ماخذات ہوتے تھے۔ یقیناً اس صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مزاج نہ صرف تحقیقی تھا، بلکہ صبر و تحمل اور مطالعہ ان کے مزاج کا ایک اہم حصہ تھا۔ نسخۂ بھوپال اور اس کی اصلاحیں کے تعلق سے گیان جین نے لکھا ہے:

''جناب عرشی نے نسخۂ شیرانی کو نسخۂ بھوپال کا مبیضہ قرار دیا ہے۔ مبیضہ سے میں یہ سمجھتا ہوں کسی مسودے کی صاف ستھری نقل۔ عرشی صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ ق (نسخۂ بھوپال) ۱۲۳۷ھ کے بعد سے نسخۂ شیرانی کی تیاری تک غالب ہی کے پاس رہا۔ غالب نے اپنے اشعار میں جو اصلاحیں یا اضافے تجویز کیے وہ پہلی بار اس نسخے کے بین السطور حاشیوں میں اور آخر میں درج ہوتے گئے۔ ان کی صاف نقل قا (نسخۂ شیرانی) ہے کیونکہ اس میں نسخۂ بھوپال کی اصلاحیں اور اضافے متن میں موجود ہیں۔

میری رائے میں قا (نسخۂ شیرانی) کو ق (نسخۂ بھوپال) کا مبیضہ کہنا محل نظر ہے کیونکہ ق (نسخۂ بھوپال) میں متعدد غزلیں اور اشعار ایسے ہیں جو قا (نسخۂ شیرانی) میں نہیں۔ دوسری طرف قا (نسخۂ شیرانی) کے متن میں

بہت سی غزلیں اور اشعار ایسے ہیں جو ق (نسخۂ بھوپال) میں نہیں۔ ان سب کی تفصیل قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین میں دی ہوئی ہے۔'' (ایضاً۔ص،۲۵)

''رموز غالب'' میں تین تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

۱: غالب کے طرفدار نہیں

۲: غالب کے نقاد

۳: غالب کی زبان ابتدائی کلام کی روشنی میں

اس کتاب کا آخری مضمون جو کہ تنقیدی حصے سے متعلق ہے، لیکن گیان چند جین نے اس میں اپنی محققانہ کوششوں کا ثبوت دیا ہے اور غالب کے ابتدائی دور کی شاعری کی روشنی میں ان کی زبان و بیان کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے غالب کے لسانی مزاج کو سمجھنے اور ان کی مخصوص زبان کا مطالعہ کرنے کے لیے ان کے ابتدائی کلام پر مفصل بحث کی ہے، جسے غالب نے منسوخ کر دیا تھا۔ غالب کا منسوخ کلام ''نسخہ حمیدیہ'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے اور نسخۂ عرشی میں ''گنجینۂ معنی'' کے نام سے اکٹھا کیا گیا ہے۔

گیان چند جین کے مطابق شاعری کی تاریخ میں غالب سب سے زیادہ فارسی زدہ شاعر ہیں۔ جس نے ابتدائی اردو اور فارسی کلام میں زبان کی حدود فاصل کو بے رحمی سے شمار کیا ہے۔ غالب نے اپنے تخیل کی وسعت کو سمانے کے لیے فارسی کا سہارا لیا۔ اس طرح ان کی شاعری دوراز فہم ہوگئی۔ بعد میں ابنائے زمانہ کے طنز و طعن کا نشانہ بنے تو اس متعلق طبیعت کو میانہ روی کی طرف مائل کیا۔ جب کہ یہ حقیقت ہے کہ غالب فارسی کلام کے مقابلے میں اپنے اردو کلام کو بے رنگ تصور کرتے ہیں، تبھی تو کہا تھا:

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن ذرا اسی حقیقت کی طرف رخ کریں کہ علم و ہنر کی دنیا میں لوگ جسے اپنی بقا کا ذریعہ یا اپنا طرۂ امتیاز خیال کرتے ہیں، آنے والی دنیا اسے بسا اوقات قابل اعتنا نہیں سمجھتی۔ غالب نے جس چیز کو مقابلتاً حقیر اور سرسری تصور کیا تھا، آنے والی نسلوں نے اسی کی پذیرائی کی۔

گیان چند جین نے غالب کی مخصوص زبان کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی ایسی تراکیب کا ذکر کیا ہے جو اردو کے مزاج کے خلاف ہیں اور جنھیں غالب نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ آپ نے ایسی متعدد مثالیں دی ہیں، جن میں غالب نے ایسے مرکبات تراشے ہیں، جن کے دونوں اجزا اہم ہیں۔ یا اگر دوسرا جز وصفت ہے تو ایسی صفت جو اسم کے طور پر بھی مستعمل ہے اور بعض اوقات ان مرکبات کو کسی اور لفظ کے ساتھ اضافت کے رشتے سے باندھ کر مزید الجھا دیا ہے۔ گیان چند جین نے اس کی مثالیں بھی دی ہے:

مے تمثال پری، نشۂ مینا آزاد
دل آئینہ طرب، ساغر بخت بیدار
تو یک جہاں قماش ہوس جمع کرکہ میں
حیرت متاع عالم نقصان وسود تھا
موج سے پیدا ہوئے پیراہن دریا میں خار
گرچہ وحشت بیقرار جلوۂ مہتاب تھا

گیان چند جین نے فارسی حروف اور مصادر کے استعمال کی شدید تر شکل کے تعلق سے لکھا ہے:

''غالب کئی ممنوع فارسی شکلوں کو ایک مرکب کے رشتے میں پرو دیتا ہے۔ ان میں عطف یا اضافت سے کام لیا جاتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک طویل عربی فارسی فقرہ نما مرکب وجود میں آجاتا ہے، جو اردو کو بالکل ایرانی قبا میں ملبوس کر دیتا ہے۔'' (ایضاً۔ ص، ۳۳۱)

گیان چند جین نے ہر حصے کو مثالوں کے ذریعے بتانے کی کوشش کی ہے۔ غالب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ فارسی مصادر اور حروف کا اردو میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔

تنقیدی حصے کا دوسرا مضمون ''غالب کے نقاد'' کے عنوان سے ہے۔ جیسا کہ اس مضمون کے عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ مضمون دراصل غالب کے ناقدین کے تعلق سے ہے۔ گیان چند جین نے غالب کے کئی ناقدین کا ذکر کیا ہے۔ جن میں الطاف حسین حالی، عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر عبداللطیف، غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سید عبداللہ اور کوثر چاند پوری شامل ہیں۔ گیان چند جین کے مطابق ان میں بیشتر ناقدین ایسے ہیں جنھوں نے سخن

فہمی کے بجائے غالب کی جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو غالب کے نقادوں میں سب سے بلند بانگ نقاد کہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے اس کے قول پر:

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب''

گیان چند جین نے کہا کہ یہ نثری شعر ہے لیکن معنی سے تہی، یہ تنقید نہیں، تشریح نہیں، قصیدہ خوانی ہے، انشائیہ ہے، طبل نوازی ہے۔ اشتہار ہے۔ وکالت ہے اور ان سب کے پردے میں اپنے علم کی بھدی نمائش ہے۔ ان کے خیال میں عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے ایک قول سے رامائن، مہابھارت، گیتا، اپنشد، کالی داس، تلسی داس، سورداس سب کو یک جنبش قلم ختم کر دیا۔ دراصل یہاں گیان چند جین خلط مبحث کا شکار ہو گئے۔ گیان چند جین کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس جملے کا تعلق تنقید یا تشریح سے نہیں ہے۔ ایک حد تک اسے قصیدہ خوانی کہہ سکتے ہیں، یہ اپنے اپنے حسن ظن پر مبنی ہے۔ بجنوری کا جملہ انشاپردازی کا نمونہ بھی ہے لیکن طبل نوازی کا لفظ گیان چند جین کی جھنجھلاہٹ کا مظہر بھی ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مضمون کی ابتدا ہی میں ایسا جملہ لکھنا کہ قاری کو فوراً متوجہ کر لے، ہنر ہے عیب نہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ محاسن کلام غالب کا پہلا ہی جملہ ہے اور اس مناسبت سے معر کے کا جملہ ہے۔ دوسری بات یہ بھی دھیان دینے کی ہے کہ گیان چند جین کو قرآن یاد نہیں آیا جس کی وجہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ تعصب کا شکار ہو گئے۔ تیسری بات یہ کہ گیان چند جین نے جن کتابوں کے نام گنوائے ہیں، وید مقدس کے مقابل ان کتابوں کو الہامی کہنا کہاں تک درست ہے؟ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کو عبدالرحمٰن بجنوری سے زیادہ گیان چند جین نے وید مقدس کی توہین کر دی۔

گیان چند جین نے ان تمام نقادوں اور تنقیدی کتب و مضامین میں سے صرف دو تنقیدی کتاب کو متوازن تنقید غالب سمجھتے ہیں۔ ایک شیخ اکرام کی کتاب ''آثار غالب'' ہے۔ ان کے خیال کے مطابق اس کتاب میں سوانح کی تحقیق کے لیے بہتر ہے اور تصانیف کی تنقید کے لیے بھی موثر ہے۔ دوسری کتاب ''نقد غالب'' ہے۔ جو علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کا نقش ثانی ہے۔ جو ۱۹۵۶ میں منظر عام پر آیا۔ جب کہ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ غالب پر حالی کی تصنیف ''یادگار غالب'' ایک منصفانہ اور متوازن کتاب ہے۔

اس کتاب کے تنقید کے حصے کا پہلا مضمون ''غالب کے طرفدار نہیں'' کے عنوان سے ہے۔ اس

مضمون میں گیان چند جین نے غالب کے کلام کے محاسن و معائب پر بحث کی ہے۔ محاسن کی بہ نسبت غالب کے کلام کے معائب کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ گیان چند جین نے لکھا ہے:

> ''غالب اکثر افراط و تفریط کا شکار رہے۔ انھیں معترض ملے یا معتقد۔ نقاد کم ملے، ان کی شاعری کی تنقیص ہوئی یا پرستش، متوازن تنقید کم ہوئی......
>
> غالب بڑا شاعر ہے لیکن کیا دیوان غالب کو عالمی معیار کی عظیم شعری کتابوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ کیا دیوان غالب کو بالمیک اور تلسی داس کی رامائن، فردوسی کے شاہنامے، ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی۔ دانتے کی ڈوائن کامیڈی، ملٹن کی فردوس گم شدہ وغیرہ کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ مجھے اس میں تردد ہے۔ شبہ ہے۔'' (ایضاً۔ ص، ۲۹۰-۲۹۱)

لیکن گیان چند جین نے غالب کو بڑا شاعر ماننے سے انکار نہیں کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے غالب کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کا تخیل فلک پیما تھا۔ البتہ انھیں یہ اعتراض ہے کہ غالب کا کوئی ایسا انتخاب نہیں کیا گیا، جسے عالمی سطح کے ادب کے مقابلے میں رکھا جاسکے۔ غالب پر جتنا لکھا گیا، اتنا کسی پر نہیں لکھا گیا۔ باوجود اس کے غالب کی قدر و قیمت کو ایک بار پھر متعین کرنے کی ضرورت ہے۔ گیان چند جین کے خیال میں ہمیں انگلی رکھ کر طے کرنا ہے کہ دیوان غالب میں کہاں کہاں عظمت کے عناصر ہیں اور کون کون سے ایسے پہلو ہیں جو عظمت کی مثال ہیں اور اسی سے غالب کے مقام کا صحیح تعین کیا جاسکتا ہے۔

تفسیر غالب:

گیان چند جین کی ''تفسیر غالب'' غالب صدی کے موقع پر شائع ہونی تھی۔ لیکن یہ کتاب ۱۹۷۱ کے آخر میں شائع ہوئی۔ جب کہ اس کام کو گیان چند جین نے ۱۹۶۸ ہی میں مکمل کر لیا تھا۔ انھوں نے کل ۱۹۵۶ اشعار کی تشریح کی ہے۔ جن میں ۱۱۴۳ اشعار قصیدے کے، ۵۰۸ اشعار غزل کے اور ۱۲ رباعیوں کی تشریح کی ہے۔ اس کے علاوہ یادگار نالہ سے ۱۱۸ اشعار، خودنوشت دیوان سے ۱۱۶۹ اشعار اور ضمیمہ نسخۂ عرشی سے ۶ اشعار۔ یہ سب مل کر ۱۹۵۶ کی تعداد ہوتی ہے۔ اسی تفصیل اور تعداد کا ذکر گیان چند جین نے اس کتاب ''تفسیر غالب'' کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ اس تفسیر کے لیے انھوں نے نسخۂ عرشی کو پیش نظر رکھا۔ البتہ ۱۱۷۵ اشعار ایسے ہیں جس کے لیے انھوں نے خودنوشت دیوان اور ضمیمہ نسخۂ عرشی کی مدد لی ہے۔

تفسیر غالب لکھتے وقت تقریباً سارے لوگوں نے 'نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا' سے شروع کیا ہے۔ لیکن گیان چند جین نے اس غزل کے مقطع سے اپنی تفسیر کا آغاز کیا ہے۔

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

گیان چند جین نے اس تفسیر کے لکھنے میں بڑی احتیاط برتی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جب اس تفسیر کے لکھنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے ابتدا میں ماہر غالب امتیاز علی عرشی کی خدمت میں چند اشعار بھیج کر اس کی تشریح چاہی۔ جب امتیاز علی عرشی نے ان اشعار کی تشریح بھیجی تو گیان چند جین دوسرے محققین سے مل کر غالب کے دقیق اشعار کے حل معنی میں مدد چاہی۔ گیان چند جین امتیاز علی عرشی کی تشریح کے کچھ حصے سے مطمئن ہوئے اور کچھ میں کسی قدر شبہ کا اظہار کیا، اور یہی وہ چیز تھی جو ان کے اعتماد میں اضافہ کر گئی۔ اس متعلق گیان چند کے جملے ملاحظہ فرمائیں:

"غالب کا یہ کلام اردو شاعری کے ذخیرے میں سب سے زیادہ دقیق اور مغلق ہے اس کے معنی تلاش کرنا ناکوں چنے چبایا ہے اور وہ بھی لوہے کے۔ شرح کی ابتدا میں میں نے عرشی صاحب کی خدمت میں تقریباً دس شعر بھیجے اور ان کے مفہوم کے بارے میں رہبری چاہی۔ موصوف نے کمالِ لطف سے ان کے معنی عنایت کئے (کیے)۔ ان میں سے بعض سے میں مطمئن ہوا۔ بعض کے بارے میں کسی قدر شبہہ رہا۔ ان کے علاوہ میں چند دوسرے چوٹی کے محققین سے مل کر بعض دقیق اشعار کے حلِ معنی میں مدد چاہی۔ ہاتھ کے ہاتھ وہ ایک بھی شعر کے معنی کی گتھی نہ سلجھا سکے۔ اب مجھے خود اعتمادی ہو گئی۔"

(تفسیر غالب ،گیان چند جین، جمو اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر۔ ۱۹۷۱۔ ص،۱۲۔ ۱۳)

یہی وہ بات تھی جس سے گیان چند جین کو لگا کہ وہ غالب کے ذہن کی کجی اور ان کے مخصوص نہج فکر سے کسی قدر آشنا ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی ان کے اعتماد میں اضافہ بھی ہوا کہ اس کام کو کیا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ غالب کے مخصوص نہج فکر کو سمجھا کسی بھی طور آسان کام نہیں تھا، لہذا انھیں بعض پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس تفسیر کے لکھنے میں گیان چند جین کو جن

دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، خاص طور سے قلم زد کلام کو، خود انھیں کی زبانی ملاحظہ ہو:

''غالب کا قلم زد کلام اجنبی فارسی محاوروں کی جنت ہے۔ فارسی لغات کے بغیر ان اشعار کے حل کی سعی نا مشکور رہے گی۔ میں نے قدم قدم پر بہار عجم اور فرہنگ آنند راج کا سہارا لیا ہے........ لیکن یہ یاد رکھیے کہ غالب کے اشعار میں بعض ضروری اجزا کے حذف ہونے کی وجہ سے شاعر کے مافی الضمیر تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔'' (ایضاً۔ ص،۱۲)

تفسیر غالب میں جن اشعار کی تشریح پیش کی گئی ہے، کوئی ضروری نہیں کہ ان سب سے اتفاق کیا جائے۔ ممکن ہے کہ بعض جگہوں پر اختلاف کی گنجائش بھی ہو۔ گیان چند جین نے تشریح ضرور پیش کی ہے، لیکن بغیر کسی دعوے کے۔ غالب کے ذہن کی کجی کو سمجھنا بعض صورتوں میں بہت مشکل ہو جاتا۔ کیونکہ ہر قرات نئے معنی کو جنم دیتی ہے۔ یہی غالب کی سب سے مشکل بات بھی ہے اور آسان بھی۔ گیان چند جین نے 'تفسیر غالب' کے متعلق خود لکھا ہے:

''میں جانتا ہوں کہ قارئین بعض صورتوں میں میری تشریحوں سے مطمئن نہ ہوں گے۔ شاید یہ شارح سے زیادہ شعر کا قصور ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں بعض صورتوں میں شاعر کے عندیہ تک نہیں پہنچ پایا ہوں ور مجھ سے بہتر تشریح ممکن ہو سکتی ہے۔'' (ایضاً۔ ص،۱۳)

درج بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گیان چند جین کلام غالب کی تفسیر لکھتے وقت کن دشواریوں سے دوچار ہوئے تھے، باوجود اس کے ان کا اعتماد متزلزل نہیں ہوا۔ اس تفسیر کے دو حصے قابل توجہ ہیں۔ ایک تو وہ جسے امتیاز علی عرشی نے اپنے نسخے میں منتخب اشعار کو ''یادگار نالہ'' کے عنوان سے ترتیب دیا ہے۔ اور دوسرا وہ حصہ جو غالب کے خود نوشت دیوان کے نئے اشعار کی تشریح کی ہے۔ اس حصہ میں ۱۶۹ اشعار شامل ہیں۔ یادگار نالہ کی تشریح کے متعلق گیان چند جین نے لکھا ہے:

''یادگار نالہ کے اشعار کی ابھی تک تشریح نہیں لکھی گئی ہے۔ ان میں بیشتر اشعار صاف ہیں صرف کہیں کہیں کوئی شعر وضاحت طلب ہے۔ چوں کہ میری کتاب کا مقصد غالب کے تمام مشکل اشعار کی شرح فراہم کرنا ہے۔'' (ایضاً۔ ص،۶۹۷)

گیان چند جین نے یادگار نامہ سے ۱۱۸ اشعار کی تشریح کی ہے۔ جن میں پانچ قطعات، تین قصائد کے چند اشعار، دو مرثیہ سے کچھ اشعار، تین سہرے سے تین اشعار کے علاوہ ۱۸ غزلوں کے منتخب اشعار کی تفسیر شامل کتاب ہے۔ گیان چند جین نے غالب کے قصیدے کے جن اشعار کی تشریح کی ہے پہلے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سن اے ندیم، برس گانٹھ کے، یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ
پئے دعائے بقائے جناب فیض مآب
لگے گی اس ثواب کی استوار گرہ
ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے بنے
بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ

درج بالا اشعار کی گیان چند جین نے جو تفسیر بیان کی ہے وہ درج ذیل ہے:

''اے ہم نشیں برس گانٹھ کے تاگے نے گرہ کا شیوہ اس لیے اختیار کیا ہے کہ یہ فیاض راجہ کی بقا کی دعا کے لیے تسبیح ہزار دانہ بنا چاہتا ہے۔ اس میں معمولی گرہیں نہیں لگیں گی بلکہ تاروں کی گرہ لگائی جائیں گی۔ عموماً تسبیح سو دانوں کی ہوتی ہے لیکن یہ ہزار دانوں کی بنا چاہتا ہے تا کہ دعا زیادہ مؤثر ہو اس کے لیے ہزار گرہوں کی ضرورت ہوگی جو ہزار سال میں ممکن ہوگی۔ ثوابت اور گرہ (ہندی میں بمعنی سیارہ) میں رعایت ہے اور ثوابت اور استوار کے لفظ میں بھی رعایت ہے۔ سال گرہ کے تاگے کو تسبیح سال بھی کہتے ہیں۔'' (ایضاً۔ ص ۱۰۵)

یہاں گیان چند جین نے بہت حد تک اشعار کی تشریح کر دی ہے، اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ ثوابت اور گرہ کو بھی واضح کر دیا کہ ثوابت عربی اور گرہ فارسی کا لفظ ہے، جبکہ سیارہ بھی عربی کا لفظ ہے، لیکن اردو میں سیارہ عرف عام میں مستعمل ہے۔ لیکن یہاں ہزار دانوں کی تسبیح چاہتا ہے کہ بنے، کے تعلق سے لکھا ہے کہ ہزار دانوں کی تسبیح بنا چاہتا ہے۔ ''تسبیح بنا چاہتا ہے'' یہ جملہ بہت واضح نہیں ہے۔ اسی طرح سے پہلے مصرع میں ''برس گانٹھ'' کی بھی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ جس

طرح سے گیان چند جین نے!

عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زنہار گرہ

میں پہلے جاذبہ کے معنی کو لکھا ہے، اس کے بعد اس شعر کی تفسیر چند جملوں میں لکھی ہے۔ اسی طرح سے اگر قصیدے کے درج بالا اشعار کے مشکل الفاظ کے معنی کے ساتھ اشعار کی تفسیر لکھتے تو یقیناً غالب فہمی کے باب میں ایک اہم اضافہ ہوتا۔ لیکن ایسا کہیں کہیں ہے، ورنہ عام طور پر جین صاحب نے مشکل الفاظ کے معنی بھی لکھے ہیں۔

گیان چند جین نے ایک شعر کی تشریح کرتے ہوئے آسی اور سرخوش دونوں سے اختلاف کیا۔ ان کا یہ اختلاف اس لیے بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دلیل بھی پیش کی ہے۔ شعر یہ ہے:

شبِ اختر، قدحِ عیش نے محمل باندھا
بار یک قافلۂ آبلہ منزل باندھا

اس شعر کی تشریح گیان چند جین نے جو کی ہے، پہلے اسے ملاحظہ فرمائیں، اس کے بعد اس اختلاف کو، جو انھوں نے کیا ہے:

''شبِ اختر، اندھیری رات۔ کیونکہ اندھیری رات ہی میں تارے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ محمل باندھنا: کوچ کی تیاری کرنا۔ بار باندھا: سفر کی تیاری کی۔ قافلۂ آبلہ منزل: وہ قافلہ جس کی منزل آبلے ہوں۔ یعنی جو اتنی دور کی منزل پر جائے کہ چلتے چلتے پاؤں میں آبلے پڑ جائیں۔ عیش چاندنی رات میں ہوسکتا ہے یا روشنی میں، اندھیری رات میں عیش کا امکان نہیں۔ عیش کے پیالے نے اس رات میں کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ آبلہ منزل تاروں کی رعایت سے کہا ہے۔ تارے آبلوں سے مماثل ہوتے ہیں۔ گویا قدحِ عیش تاروں کی منزل کی طرف جانے والا قافلہ ہے۔ آبلہ منزل قافلے کا ہار باندھنے سے مراد ہے۔ خود آبلہ منزل ہونے کا ارادہ کرنا یعنی اتنی دور کا سفر کرنا کہ آبلہ پائی سے دوچار ہونا پڑے۔

مطلب یہ ہوا کہ اندھیری رات میں عیش ہم سے دور، نہایت دور چلا گیا۔'' (ایضاً۔ص،۷۳-۷۴)

آسی اور سرخوش کی تشریح کے تعلق سے لکھا ہے:

''آسی اور سرخوش دونوں نے پہلے مصرع کے معنی قدحِ عیش کا رواں ہونا یعنی گلکھرے اڑانا لئے ہیں۔لیکن دوسرے مصرع کے پیشِ نظر یہ باطل ہوجاتا ہے۔اسی نے دوسرے مصرع کی نثریوں کی---''باریک قافلہ آبلہ کو اپنی منزل سمجھا۔'' یہ بھی صحیح نہیں۔سرخوش نے شب اختر کے معنی چاندنی رات درج کئے ہیں جو موزوں نہیں۔'' (ایضاً)

مندرجہ بالا شعر کی تشریح سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گیان چند جین نے غالب کی کجی کو بہتر طریقے سے سمجھ سکے۔اس کا اندازہ ان کی تشریح سے بھی ہوتا ہے۔لیکن اختلاف کی گنجائش بہر صورت ہوتی۔ یہ کمال شارح سے زیادہ غالب کے ذہن کا ہے۔اسی طرح سے غالب کی ایسی رباعی ہے جسے پڑھ کر ان کے شیعہ ہونے پر بھی شبہ ہوتا ہے۔رباعی ملاحظہ ہو:

یاران رسول یعنی اصحاب کبار
ہیں گر چہ بہت، خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار
غالب، وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ چاروں خلیفہ میں سے کسی ایک کا بھی انکار کیا تو وہ مسلمان نہیں۔اس رباعی میں غالب نے یہ کہا ہے کہ یوں اصحاب رسول بہت ہیں، لیکن خلیفہ ان میں چار ہی ہیں۔آگے یہ کہتے ہیں کہ ان چار میں ایک سے کسی نے بھی انکار کیا تو وہ مسلم نہیں رہا۔یہاں غالب یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ ان چار میں سے ایک سے بھی ہو جسے انکار۔بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ 'ان چار میں ایک سے' جس کو انکار ہو وہ مسلم نہیں۔وہ ایک سے مراد بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔اس شعر کی تشریح گیان چند جین کی زبانی ملاحظہ ہو:

''صرف تیسرے مصرعہ کی ایک نہفتہ شوخی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے بہ ظاہر اس مصرع اور شعر کے معنی یہ ہیں کہ ''چاروں خلفا میں سے کسی ایک سے بھی کوئی انکار کرے تو وہ مسلمان نہیں۔''لیکن غالب نے ایک یہ پہلو بھی

ذہن میں رکھا ہے"ان چاروں خلفا میں سے صرف ایک یعنی حضرت علی ایسے ہیں کہ کوئی ان سے انکار کرے تو وہ مسلمان ہی نہیں رہتا۔" (ایضا۵۶۶)

گیان چند جین ایک محقق تھے، ان کا ذہن نئی نئی چیزوں کو ڈھونڈھنے میں لگا رہتا تھا۔اس کا ثبوت غالب کے ایک شعر کی تشریح میں بھی انھوں نے دیا ہے۔پہلے وہ شعر ملاحظہ ہو:

اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسد
زور نسبت مے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک

اس شعر میں "نصارا کا نمک" سے کیا مراد ہے واضح نہیں۔اس کی وضاحت گیان چند جین نے مالک رام اور قاضی عبدالودود سے چاہی تو ان دونوں نے اس کے معنی سے لاعلمی کا اظہار کیا۔اس کے بعد امتیاز علی عرشی کو اس متعلق لکھا تو انھوں نے جو تشریح بھیجی پہلے وہ ملاحظہ ہو:

"نصارا کا نمک سے مراد وہ پنشن ہے جو غالب کو ملا کرتی تھی وہ بہت مختصر تھی اس لیے غالب کے لیے ناممکن تھا کہ اس سے مے نوشی کا خاطر خواہ سامان کر سکیں تو گویا نصارا کا نمک جو یہ کھاتے تھے وہ بجائے لذت عیش کو بڑھانے کے وہ کام کرتا تھا جو شراب میں نمک ڈالنے سے ہو جاتا ہے یعنی اس سے شراب کا سکر (نشہ) ختم ہو جاتا ہے اور وہ سرکے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔" (ایضاص۔۲۳۸)

اب اس تشریح سے کوئی بھی مطمئن ہو سکتا ہے۔اس کی دو وجہ ہے۔ایک تو امتیاز علی عرشی اس کے شارح ہیں دوسرے یہ کہ جو تشریح کی ہے اسے ذہن بھی قبول کرتا ہے۔لیکن گیان چند جین اس تشریح میں تھوڑی سی قباحت ظاہر کرتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ یہ شعر نسخۂ بھوپال کا ہے۔یعنی ۱۸۲۱ سے پہلے کا شعر ہے اور اس وقت تک غالب کو انگریزوں سے براہ راست پنشن نہیں ملتی تھی۔ان کی آمدنی کے کئی ذرائع تھے۔اس لیے بہت شبہ ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کی نمک خواری کا شکوہ کریں۔اب اس شعر کی تشریح گیان
چند جین کی زبانی ملاحظہ ہو:

"نصارا کا نمک سے مراد عیسائی حسیناؤں کا نمکِ حسن ہے۔غالب نے بعد میں کلکتہ میں تو میموں کے حسن پر بڑی للچائی نظر ڈالی ہے جیسا کہ ان کی فارسی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے۔یقینی ہے کہ دہلی میں بھی کچھ انگریز

حسینا ئیں دیکھی ہوں گی۔ قباحت یہ ہے کہ ان کے حسنِ صبیح میں ملاحت
کہاں۔ بہر حال مے نوشی کے عمل میں مجھے لذت نہیں ملتی تاوقتیکہ کوئی نمکین
نقل ساتھ نہ ہو۔ نمکِ حسینان نصارا کا نقل شراب سے گہرا تعلق رکھتا
ہے۔ یہ نمک مے نوشی کا ساتھ دینے کو میسر آجائیں تو عیش کی لذت مل
جائے۔" (ایضاً۔ص ۲۳۸)

درج بالا دونوں تشریح مایہ ناز محققین کی ہیں۔ تشریح کی حد تک دونوں اپنی اپنی جگہ درست بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اس شعر کو زمانے کے تعین کے ساتھ جب تشریح کی گئی تو معنی اور مطلب دونوں بدل گئے۔ اور یہی گیان چند جین کی خوبی ہے کہ وہ تحقیق کا کوئی بھی دقیقہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اسی طرح کی بے شمار ایسی مثالیں ہیں جو "تفسیر غالب" میں بھری پڑی ہیں۔ گیان چند جین اس تفسیر سے خود کو غالب شناس کی فہرست میں کھڑے پاتے ہیں۔ 'گیان چند جین نے غالب کے کلام کی کیف آور صہبا کو اپنی نکتہ آفرینیوں سے غالب کے شیدائیوں کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ تفسیر غالب کے ذریعہ گیان چند جین نے غالب شناسی کے نگار خانے میں بصیرت کی ایک نئی اور رنگین شعاع کا اضافہ کیا ہے۔'

گیان چند جین کا شمار ایسے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی زندگی کا اہم ترین حصہ اردو زبان وادب کی خدمت میں۔ ان کی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع اور غیر معمولی ہے۔ انھوں نے اپنا سارا اثاثہ اردو زبان میں چھوڑا ہے۔ اردو دنیا میں ان کی شناخت ایک استاد، محقق اور ماہر لسانیات کی ہے۔ ان کی تصانیف مختلف یونیورسٹیوں میں نصاب کی کتابوں کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ان کتابوں کو سند کا درجہ حاصل ہے۔ بالخصوص تحقیق سے وابستہ اساتذہ اور طلبہ میں ان کی تصانیف کی مقبولیت کسی سے پوشیدہ نہیں، جو تحقیق میں مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ اردو ادب کے مختلف نظریات، رجحانات اور تحریکات کے پیرو کاروں میں یکساں مقبول ہیں۔ غالب کے تعلق سے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ازسر نو جائزہ لیا جانا چاہیے۔ گیان چند جین کے یہ تحقیقی وتنقیدی مضامین یقیناً مطالعۂ غالبیات کا اہم حصہ ہیں۔ جہاں بیک وقت وہ محقق، ناقد اور شارح کے طور پر نظر آتے ہیں۔

O

نوشاد منظر

غالب ہندی ادیبوں کے درمیان

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

مرزا غالب کی شہرت اور مقبولیت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اردو ہی نہیں دنیا کی بیشتر بڑی زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، ترکی، فارسی کے علاوہ ہندی اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں غالب کے تراجم ہونے کے ساتھ ساتھ غالب مطالعات کی روایت بھی مستحکم ہو چکی ہے۔ میں نے اپنے مقالے کے لیے غالب کے ہندی ناقدین کا انتخاب کیا ہے۔ غالب کو بھی اپنی عظمت کا اندازہ تھا، جس کی طرف اپنے کئی اشعار میں انھوں نے اشارہ بھی کیا ہے۔

ہندی میں غالب پر جو کچھ لکھا گیا اس کے ایک حصے کا ترجمہ میں نے کیا ہے جو 'غالب نامہ، دسمبر ۲۰۱۷' میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ ان میں جہاں چند مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں تو دوسری جانب ایسے مضامین بھی ہیں جن میں غالب کی شاعری پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے غالب فہمی میں کتنی مدد ملے گی یہ کہنا تو مشکل ہے مگر اتنی بات ضرور ہے کہ غالب کو ہندی قارئین سے متعارف کرانے کا یہ ایک اہم وسیلہ ضرور ہوگا۔ یہ مضامین یوں تو ہندی میں لکھے گئے ہیں مگر ایک قاری کے طور پر ان مضامین کی قرأت میں ایک نئے تجربے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ جہاں ایک طرف اردو اور ہندی کے درمیان ایک خلیج پیدا

کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہیں دوسری جانب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب کا ایک الگ مقام نظر آتا ہے۔

غالب پر جن مضامین کا ترجمہ میں نے کیا ہے ان میں شمشیر بہادر سنگھ کا ایک مضمون ''غالب: میری نظر میں'' ہے۔ غالب کی شخصیت اور ان کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

> ''غالب جیسے سچے اور کھرے لوگوں کے لیے کیا یہی تقدیر ہے؟ ایمانداری کا کوئی مطلب نہیں؟ وفاداری کا کوئی معنی نہیں؟ خوبصورتی اور محبت کا اختتام کیا؟ ساز انتظام ایک تماشا جیسا ہے۔ ریتی، رواج، اصول، فلسفیانہ نظر، کائناتی رشتہ......سب۔
>
> شاید ایک چیز جو دائمی ہے وہ فن ہے، اور وہ ہے غالب کے لیے غالب کا اپنا فن۔ اس فن کے دل میں موجود شاعر بالکل زندۂ جاوید نظر آتا ہے۔ کم از کم خود اپنی نظر میں......اور بہت بعد میں ہم کو بھی ویسا ہی نظر آتا ہے۔
>
> غالب کا نظریہ تصوف، صوفیوں کی روایت سے بالکل مختلف اور نیا معلوم ہوتا ہے۔ اگر غالب کے نظریہ تصوف کا تجزیہ کیا جائے تو وہ شعری روایت قطعی طور پر نہ ہوتے ہوئے بھی کہیں ملحد اور کچھ کچھ ماورائی صوفی ازم نکلے گا۔''

غالب کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں۔ انہوں نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے تخیّل کی بلندی اور شوخیِ فکر کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شِدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق کا روایتی رنگ، تصوف کی پاکیزہ روایت، تشکیک، فلسفیانہ خیالات اور انسانی زندگی اور اس کے احساسات سے متعلق دیگر موضوعات جا بجا ملتے ہیں۔ حالی نے غالب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اتنی بہادری سے اپنی اور اپنے گرد و نواح کی سچائی کو صاف اور جوں کا توں رکھنے والا شاعر اردو میں آگے پھر نہ ہوا'' غالب کی شاعری کا ایک پہلوان کا منطقی اور استدلالی انداز بیان ہے۔ اسلوب احمد انصاری نے لکھا ہے کہ ''غالب صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان میں باہمی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ صرف اشاروں سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے نرم و لطیف، احساسات و کیفیات کا تجزیہ کرتے اور ان

پر استدلال کرتے ہیں۔ شمشیر بہادر سنگھ کا یہ مضمون تاثراتی ہونے کے باوجود غالب کی شاعرانہ خوبیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

احمد حسین کا مضمون ''غالب کی جدیدیت'' بھی ہندی میں لکھا گیا تھا۔ احمد حسین نے اپنے مذکورہ مضمون کا آغاز اس خیال سے کیا ہے کہ اگر کوئی شخص غالب کی تعریف کرتے ہوئے انہیں جدید شاعر کہہ دیتا تو یقیناً غالب اس سے خوش نہیں ہوتے کیونکہ جدیدیت کی جو تعریف آج کی جاتی ہے اس کے برعکس غالب کے عہد میں جدید ہونا ایک عیب تصور کیا جاتا تھا، مگر اس خیال کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ غالب کے یہاں صرف روایتی شاعری کا عکس ملتا ہے بلکہ ان کی شاعری جدید شاعری کی عمدہ مثال ہے۔ احمد حسین کا خیال ہے کہ غالب نے بیدل کی پیروی ضرور کی مگر جلد ہی انہوں نے مشکل پسندی اور گنجلک تراکیب کو ترک کر کے اپنی شاعری کے مزاج کو بدل دیا۔ محمد حسین لکھتے ہیں:۔

> ''بیدل کے اور اپنے نقش بت طناز والی شاعری کو ہنر سمجھتے ہوئے بھی بدلنا پڑا لیکن میر، درد اور سودا کی رواجوں، دلّی کی زبان کی گھلاوٹ، ستھری شاعری میں عوام کے ایک اچھے خاصے حصے کی دلچسپی، یہاں کے اعلیٰ ادب کا اثر، دوستوں کی صلاح اور دشمنوں کے طنز اور پھر انگریزی حکومت کے اعتماد کی وجہ سے ایک بار جو انھوں نے بدلنا شروع کیا تو اتنی تیزی سے بدلے کہ کچھ سالوں کے بعد ''شمارہ سبحہ'' .... کے درویش سے
>
> آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
> اب کسی بات پر نہیں آتی
>
> کے اپنے خاص ملک میں پہنچ گئے۔''

غالب کی مشکل پسندی کو ان کے معاصرین نے جس طرح دیکھا اور پھر اس کا مذاق بنایا اس سے ہم سب واقف ہیں۔ دراصل دیکھا جائے تو غالب نے فارسی تراکیب کے استعمال سے اردو کے دامن کو مزید وسعت دی ہے، اس سے غالب کی شاعری میں ایک نکھار بھی پیدا ہوا۔ حالانکہ معاصرین کے طنزیہ جملوں سے تنگ آ کر انہوں نے مشکل پسندی کو ترک کر کے سادہ اسلوب اختیار کیا۔ غالب کے مزاج کی یہ تبدیلی کہیں نہ کہیں اس دور کے تقاضوں کی مجبوری تھی۔ غالب کی ابتدائی شاعری میں عرفی اور نظیری کا رنگ نظر آتا ہے جس سے ان کی شاعری میں

مشکل تراکیب آتی ہیں مگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ عرفی اور نظیری سے ہوتے ہوئے جب غالب کی رسائی میر تقی میر تک ہوتی ہے تو ان کے انداز اور اسلوب میں سادگی اور سہل پسندی آجاتی ہے۔ حالانکہ ایک مدت تک غالب کا خیال تھا کہ ان کا اصل کلام فارسی کلام ہے مگر جب اردو کلام میں ان کا نام ہر جگہ گونجنے لگا تو غالب کو فارسی کی مشکل پسندی سے میر کی سہل نگاری کی طرف سفر کرنا پڑا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ غالب کی گنجلک اور مشکل پسندی سے دوری کو محمد حسین ایک الگ زاویہ سے دیکھتے ہیں:

"نظیر کے عوامی انداز سے بھاگنے والا شاعر، عوامی زبان، عوامی طرز، عوامی بولی اور عوامی آواز میں بیدل اور عرفی کے معنی ادا کرنے والا سب سے کامیاب شاعر بن گیا...... اور اسی کے ساتھ عوامی جذبات کو بیدل اور عرفی بلکہ ان سے بھی افضل زبان اور اسلوب میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی اس نے کمال کو پہنچا دیا۔"

غالب نے فارسی کا سہارا لیے بغیر رواں اسلوب بلکہ اردو اسلوب وضع کیا۔ زبان کی سادگی ان اشعار کی معنوی قدر و قیمت اور ان کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ کیونکہ یہ سادگی شعری تجربے سے ہم آہنگ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

غالب ان معنوں میں جدید ہیں کہ انہوں نے اس زمانے میں جب جدید ہونا ایک عیب تصور کیا جاتا تھا، اپنی فنکارانہ خوبیوں اور بلند تخئیل سے ایک ایسی دنیا آباد کی جو اس زمانے کے لیے ہی نہیں بلکہ آج بھی ہمارے لیے نئی ہے۔ احمد حسین نے غالب کی شاعری اور ان کے مزاج پر گفتگو کرتے ہوئے مومن اور ذوق جیسے معاصر اور ان سے رشتے پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کی ایک بڑی خوبی جس کی جانب مضمون نگار نے بھی اشارہ کیا ہے کہ غالب انسان شناس

تھے۔غالب کے ذہن وادراک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے احمد حسین نے ذوق اور مومن کے ایک ایک شعر کو پیش کیا ہے۔پہلے ذوق کا شعر دیکھئے:۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

احمد حسین نے لکھا ہے کہ غالب نے اس شعر کو پسند تو کیا مگران کا جورویہ مومن کے اس شعر پر تھا کہ اپنا پورا دیوان اس کے بدلنے میں دینے کو تیار تھے، وہ رویہ ذوق کے ساتھ نہیں تھا۔ مومن کا شعر سنیئے:۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے بدلے غالب دیوان دینے کو تیار ہو گئے تھے۔مگر ذوق کے مذکورہ شعر کو پسند تو کیا مگران کے اس شعر کو مومن کے شعر کا ہم پلہ نہیں قرار دیا۔

جن ہندی ادیبوں کے مضامین کا ترجمہ میں نے اردو میں کیا ہے ان میں ایک نام عبدل بسم اللہ کا بھی ہے۔عبدل بسم اللہ شعبہ ہندی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ رہے، ہندی میں ان کے ناول اور کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔مگر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب پران کی گرفت قابل رشک ہے۔انہوں نے اردو کے کئی اہم لکھنے والوں پر مضامین قلم بند کیے ہیں۔غالب پر بھی ان کا مضمون ''غالب کے محاورے'' بھی ایک اہم اور قابل مطالعہ مضمون ہے۔کسی بھی زبان کی خوبی اس کی سلاست، عام فہمی، نرمی، موزونی، چھوٹے چھوٹے الفاظ اور بڑے بڑے مطالب پر موقوف ہے۔محاورات وہ مرقعے ہیں جو کسی سماج کے تجربات، تصورات اور تاثرات کی نمائندگی کرتے ہیں۔عام لوگوں کی زبان کو پایۂ اعتبار سے گرانا زبان کے زوال اور عدم مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔محاوروں کا استعمال گفتگو میں دلچسپی پیدا کرتا ہے، یہی نہیں یہ محاورے اکثر طویل جملوں سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔جہاں تک غالب کے محاوروں اور اس کے استعمال کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عبادت بریلوی کا ایک قول ملاحظہ کیجیے۔وہ لکھتے ہیں، ''غالب زبان اور لہجے کے چابک دست فنکار ہیں، اردو روزمرہ اور محاورے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دل میں اتر جاتی ہے۔''

عبدل بسم اللہ نے اپنے مضمون میں غالب کی شاعری میں موجود محاوروں کے ساتھ

ساتھ محاوروں کے استعمال اور پھر معنی آفرینی میں اضافے پر روشنی ڈالی ہے۔عبدل بسم اللہ نے غالب کا ایک شعر درج کیا ہے:

کہتے ہو، نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجیے ،ہم نے مدعا پایا

اس شعر میں ایک محاورہ ''پڑا پایا'' کا استعمال ہوا ہے۔عبدل بسم اللہ نے لکھا ہے کہ غالب کے شعر کی تشریح جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اس لیے انہوں نے بیشتر اشعار کی تشریح کرنے کے بجائے صرف ان اشعار میں موجود محاوروں کے معنی اور اس سے شعر کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔محولہ بالا شعر میں موجود محاورہ ''پڑا پایا'' کے متعلق لکھتے ہیں۔

''یہ ایک ایسا محاورہ ہے جس کا استعمال عام طور پر بچے کیا کرتے تھے۔ کوئی چیز اگر کہیں پڑی ہوئی مل گئی تو پانے والا بچہ (یا بچی) اس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔کوئی لاکھ منطق پیش کرے کہ یہ تمہارا نہیں، میرا ہے، پر وہ اس ضد پر اٹل رہتا تھا کہ میں نے تو ''پڑا ہوا'' پایا ہے۔اب یہ تمہارا نہیں میرا ہے۔ میں اسے تمہیں نہیں دوں گا۔ اس بچے کی طرح کے جذبات کو فلسفیانہ شکل مرزا غالب ہی دے سکتے تھے۔''

عبدل بسم اللہ نے غالب کی شاعری میں موجود کئی دیگر محاوروں کی تشریح وتعبیر کی کوشش کی ہے۔غالب کی شاعری میں جن محاوروں کا استعمال ہوا ہے ان پر غور کرتے ہوئے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل مشترکہ تہذیب کی جانب ایک اشارہ بھی ہے۔غالب کا ایک شعر اور دیکھئے:۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

دنیا اور انسانی زندگی کے متعلق مفکر اور فلسفی سے لے شاعر وادیب نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔کسی نے اسے عذاب سے تعبیر کیا ہے تو کسی نے امتحان گاہ سے، مگر غالب نے اسے بچوں کے کھیل سے تعبیر کیا ہے۔چونکہ 'بچوں کا کھیل' ایک محاورہ ہے اور ہم اسے عام زندگی میں استعمال بھی کرتے ہیں۔اب دیکھئے عبدل بسم اللہ کیا کہتے ہیں کہ اس شعر کی سچی تشریح یا تعبیر کرنا بے حد مشکل ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ غالب نے اس محاورے کو استعمال کر دنیا اور اس کی تمام رنگینی کو بچوں کے کھیل سے تشبیہ دے کر شعر کو ایک نئی جہت دینے کی کوشش کی ہے۔جیسا کہ میں

نے عرض کیا عبدل بسم اللہ نے کئی محاوروں کا ذکر کیا ہے جو غالب کی شاعری میں موجود ہے۔ ایک شعر اور دیکھئے:

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

نظر لگانا ایک محاورہ ہے، جس کا استعمال مذکورہ شعر میں ہوا ہے۔ اب عبدل بسم اللہ کی تشریح ملاحظہ کیجئے:

''اس محاورے میں لفظ 'نظر' ہندی کا نہیں ہے، باہر سے آیا ہے۔ عربی زبان کا ہے، معنی ہے دیکھنا۔ مگر ذرا غور کیجیے کہ اس ایک لفظ نے ہمارے یہاں کتنے محاورے جنم دیے ہیں۔ نظر لگنا، نظر لگانا، نظر پر چڑھانا، نظر سے اتارنا، نظر ڈالنا، نظر پھیرنا، نظر نیچی کرنا، نظر اٹھانا، نظر مارنا ......وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ ہندی کو غیر ملکی زبانوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں وہ اس لفظ کے بدلے دوسرے لفظ کا استعمال کر کے ذرا دیکھیں۔ مثال کے طور پر 'درشٹی' [نظر] کو آزمائیں، پھر دیکھیں کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ خیر، ہمارا یہ ماننا ہے کہ 'نظر' اب ہمارا لفظ ہے، مذکورہ بالا تمام محاورے ہم نے بنائے ہیں، ہماری ہندوستانی عوام نے تیار کیا ہے، اس لیے اس پر ہمارا حق ہے۔ غالب کا حق بھی ایک ہندوستانی شاعر کی حیثیت سے تھا، ...یعنی میرے جگر پر جو زخم ہے وہ اس کے ہاتھ سے لگا ہے، اس لیے اس کے ہاتھ کی طرح زخم بھی خوبصورت ہے، بلکہ کہیں زیادہ۔ اور ہاتھ کا مطلب ہے پورا ہاتھ، بازو کے ساتھ۔ اس لیے ڈر ہے کہ جو لوگ میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں، وہ کہیں اس کے ہاتھ اور بازو کو نظر نہ لگا دیں۔''

پاؤں پڑنا، پاؤں دبانا، پاؤں دھو کر پینا:

غالب کے یہاں ایسے اشعار بآسانی مل جاتے ہیں جن میں پاؤں پڑنا، پاؤں دبانا، پاؤں دھو کر پینا وغیرہ محاوروں کا استعمال ہوا ہے۔

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروئے شیریں سخن کے پاؤں

دوسرے شعر کی روشنی میں عبدل بسم اللہ لکھتے ہیں:

''پاؤں دھونے کا پس منظر بھی شیریں اور فرہاد کے وہی محبت کی داستان ہے، جس میں اشاروں میں انہوں نے شیریں کے شوہر 'خسرو' کا بھی نام دے دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے کلام میں جو مزہ ہے وہ اس لیے ہے کہ میں 'خسروئے شیریں سخن' کے پاؤں دھودھو کر پیتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ جس نے خسرو اور شیریں کی کہانی میں متوقع محبت کی شیریں داستان کو پڑھا ہوگا اس کی شعری تخلیق بھی دلچسپ ہوگی۔ دراصل یہاں نظامی کی مشہور مثنوی 'خسروئے شیریں' کی جانب بھی اشارہ ہے، جو فارسی زبان کی بے مثال شعری تخلیق ہے۔ خسرو، شریں کا شوہر تھا اور فرہاد شیریں پر فریفتہ تھا۔''

زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں نے ادبی فن پارے میں محاورات کے استعمال پر یقیناً غور کیا ہوگا، عبدل بسم اللہ کی یہ کوشش بھی اس کا حصہ معلوم ہوتی ہے، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ عبدل بسم اللہ نے محاورات کے استعمال کے بجائے غالب کی شاعری میں موجود محاورات پر روشنی ڈالی ہے۔

غالب کی شاعری پر ایک مضمون ''وشنو ناتھ ترپاٹھی کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون ''مشکل پسندی کا شاعر غالب'' میں غالب کی مشکل پسندی اور اس کی معنویت پر اظہار خیال کیا ہے۔ وشنوناتھ ترپاٹھی نے اپنے مضمون کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے کہ شاعری سے کم دلچسپی لینے والا شخص غالب کی شاعری کے متعلق یہ کہہ سکتا ہے کہ:

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

انہوں نے اس بات کو مزید بڑھاتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب کی شاعری کو سمجھ دار قاری ہی سمجھ سکتا ہے، کیونکہ غالب کے دل کا راستہ اس کے دماغ سے ہوکر گزرتا ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے غالب کی ایک خوبی کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ غالب جتنا بڑا شاعر ہے اسی قدر اپنی شاعری سے بے نیاز نظر آتا ہے، انہوں نے تلسی داس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ

بے نیازی مذکورہ دونوں شعرا کے یہاں نظر آتی ہے۔

غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے وشوناتھ ترپاٹھی نے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی زندگی کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کن مشکل ترین مسائل سے نبرد آزما رہے ہوں گے۔ اس مشکل وقت میں ان کا ساتھ کسی نے نہیں دیا بلکہ ان مسائل کا مقابلہ انہوں نے خود کیا۔ غالب کے یہاں جو مایوسی اور اضطراب کی کیفیت ہے یا تشکیک کا جو رویہ ملتا ہے وہ دراصل ان کی ناکامی کا احساس ہے، مگر اس کا ایک مثبت فائدہ یہ ہوا کہ غالب نے اپنی عقل پر بھروسہ کرنا شروع کیا۔ دوسرے لفظوں میں ان کے اندر خود اعتمادی آئی جس سے وہ بقول وشوناتھ ترپاٹھی 'تمام لالچوں سے آزاد ہو گئے' غالب کی شاعری کا ایک حصہ مشکل پسند تو ہے اور انہوں نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھو
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

مگر جب ان پر اعتراض ہوا اور یہ کہا گیا کہ ''ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے'' تو غالب نے اپنی شاعری میں گنجلک الفاظ اور فارسی تراکیب کے استعمال سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد ان کی شاعری کا ایک دوسرا رنگ نظر سامنے آتا ہے:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

کرشن موہن کا مضمون ''یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے میری بات: 1857 کی حقیقت اور غالب'' ایک اہم مضمون ہے۔ اس مضمون میں غالب اور ۱۸۵۷ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون کا آغاز ان کی نسبتاً کم پڑھی گئی غزل سے ہوتا ہے۔ غزل کا مطلع دیکھئے:

گلشن میں بندوبست برنگ دگر ہے آج
قمری کی طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

مذکورہ شعر پر گفتگو کرتے ہوئے کرشن موہن لکھتے ہیں:

''شعر کا مفہوم ہے کہ باغیچے کا انتظام آج دوسرے طریقے سے ہوگیا ہے۔
پہلے جو پھندا پرندے کے ارد گرد تھا، اب وہ دروازے کا دائرہ بن گیا ہے۔ اوپری طور پر تو پرندہ اپنا گیت گانے کے لیے آزاد ہے، لیکن یہ آزادی ایک قید خانے کے اندر کی آزادی ہے۔ آب وہوا میں آزادی کی جگہ گھٹن بھر گئی ہے، اور پورا ماحول آلودہ ہوگیا ہے۔ یہ فرق حکمراں طبقے کی سختی اور سخاوت کا ہے۔ انیسویں صدی میں انگریزوں نے ان ہتھکنڈوں کا بخوبی استعمال کیا تھا۔ ہمارے موجودہ حکمراں اس کی تقلید کرتے نظر آجاتے ہیں۔ یہاں دوسرے ڈھنگ کے انتظام کی بات میں طنز اور پریشانی ہے۔ اول تو وہ پہلے سے الگ ہے نہیں، اور پھر اسے آزاد کرنے والا سمجھا جارہا ہے جب کہ وہ غلامی کو ہی اور گہرائی دیتا ہے۔''

غالب کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے کرشن موہن نے جن باتوں کی جانب اشارہ کیا ہے وہ کافی اہم ہے۔ اس ایک شعر میں جہاں عہد غالب کی سیاسی صورت حال ہم پر عیاں ہوتی ہے وہیں دوسری جانب اس شعر کی آفاقی جہت ہمیں حکمراں طبقہ کے ظلم وزیادتی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، ساتھ ہی اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ آزاد فضا کی اہمیت کیا ہے۔ یہاں ایک سوال قائم ہوتا ہے کہ کسی بھی ادیب اور شاعر کے خیالات کو حقیقت سمجھ کر قبول کرنا یا اس سے کوئی سیاسی معنی دریافت کرنا کس حد تک درست ہے؟ اس مضمون میں کرشن موہن نے لکھا ہے:

''کسی سیاسی واقعہ سے شاعری کا رشتہ اس میں بیان کئے گئے خیالات، احساسات، خواہشات اور قدروں کے ہی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس معاملے میں خود شاعر کے خیالات کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی۔ مثلاً 1857 کے دوران غالب نے انگریزوں کو دکھانے کے لیے ''دستنبو'' نام کی اپنی ڈائری میں انقلابیوں کی تنقید کی ہے، اس کی اہمیت گلیلیو کی اس تنقید سے ہے جو اس نے گرجا گھر کے سامنے اپنے اوپر کی تھی۔''

کرشن موہن نے غالب کے مندرجہ ذیل چند اشعار بھی پیش کیے ہیں۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

تو گویا غالب ان اشعار کے ذریعے دستنبو میں لکھے گئے خیال کا دفاع کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آواز کے راز کو پہچانا جائے، اس کی تہہ تک جایا جائے تبھی صحیح معنی دریافت ہوں گے۔ کرشن موہن نے ایسے اشعار بھی پیش کیے ہیں جن میں اس دور کی حقیقتوں کی جانب اشارے ملتے ہیں۔ کرشن موہن نے لکھا ہے کہ جب ہندوستان میں ریلوے کی ابتدا ہوئی تھی تو کارل مارکس نے کہا تھا کہ یہی ریل انگریزوں کے زوال کا ذریعہ بنے گا۔ کرشن موہن نے غالب کا ایک شعر پیش کیا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولہ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اس شعر پر گفتگو کرتے ہوئے کرشن موہن لکھتے ہیں ''میری تعمیر میں ہی بربادی کی ایک وجہ پوشیدہ ہے، اناج (خرمن) پر گرنے والی بجلی میں کسان کا گرم خون ہی ایندھن بن کر متاثر ہوتا ہے۔'' کرشن موہن نے غالب کی شاعری کو نو آبادیاتی تناظر میں پیش کیا ہے۔ کرشن موہن نے اپنے مضمون کا اختتام ان خیالات پر کیا ہے:

''۱۸۵۷ کی ناکامی کے بعد برطانوی قوانین کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ ہمدردی اور اظہار کے ان طریقوں کو بھولتے چلے گئے، جو غالب کے لیے پانی اور ہوا کی طرح فطری تھا۔ اس نو آبادیاتی بوجھ کو اتار پھینکے بنا ہم جدید جمہوری قدروں کے اپنے اندرونی ماخذ سے بیگانے ہی رہیں گے اور اس طرح ہمیشہ کسی نہ کسی سے مانگے ہوئے افکار کے سہارے اپنی راہ ٹٹولنے کو مجبور ہوں گے۔''

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کرشن موہن نے غالب کی شاعری کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے ہندی ناقدین میں ایک نام ''نند کشور آچاریہ'' کا بھی ہے۔ ان کا ایک

مضمون 'ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر' ہے۔ نند کشور اپنے مضمون کے آغاز میں غالب کو ہندوستانی زبان کا پہلا جدید شاعر قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی ایک بنیادی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ غالب کے یہاں انسانی تجربہ، اچھے برے کی تمیز کے ساتھ آزادیٔ فکر کو مرکزیت حاصل ہے:

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

نند کشور وکرم کا مضمون غالب کی شاعری میں موجود انسان اور اس کی فکری آزادی کے ارد گرد نظر آتا ہے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ غالب کے وجدان کی ایک بڑی وجہ یہی آزادی فکر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ''جدید شعری عمل میں اگر نتائج سے زیادہ عمل کی، منزل سے زیادہ سفر کی اہمیت ہے تو اسی لیے کہ سند نتائج میں نہیں بلکہ عمل میں، منزل میں نہیں بلکہ سفر میں ہے۔ یہی وجدان غالب کے یہاں شعری افکار پاتا ہے'' نند کشور آچاریہ نے غالب کا ایک شعر درج کیا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا میرے آگے

اس شعر کی روشنی میں نند کشور آچاریہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ انسانی زندگی اور تجربات کو سیاہ وسفید کے واضح اصولوں میں میں تقسیم کرنے کے عادی ہیں، انہیں یہ سمجھ نہیں آتا کہ غالب کس پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ مذہبی معلوم ہوتے ہیں اور نہ ہی ملحد۔ یہی غالب کی خوبی ہے کہ ان کی مذہبیت بھی حقیقی معلوم ہوتی ہے اور ان کی ناامیدی بھی۔ نند کشور نے اپنے مضمون میں غالب کی شاعری کی مختلف جہتوں پر اپنے خیالات پیش کیے ہیں انہوں نے اپنے مضمون کے اختتام پر ایک دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندی کے قارئین کے لیے غالب کی شاعری کی ایک دوسری اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ وہ ایک قسم سے ہندی کی کھڑی بولی، شاعری کی بنیادی بولی بھی ہے۔ یہ یاد رکھنے والی بات ہے کہ ہندی نے اپنی شاعری کی زبان کے طور پر کھڑی بولی کو اردو کے مقابلے دیر سے اپنایا۔ اردو کے فارسی رنگ کو زیادہ اہمیت دینے کی وجہ سے اس جانب لگ بھگ توجہ ہی نہیں دی گئی ہے کہ انیسویں صدی کی اردو شاعری میں کھڑی بولی کی وجہ سے جن محاوروں نے ترقی حاصل کی، اس کے بعد ہندی شاعری کے

محاوروں پر گہرا اثر پڑا ہے۔اس کے فارسی رنگ کا نہیں بلکہ کھڑی بولی کی
اس روانی کا جوانیسویں صدی کی اردو شاعری میں غالب کے یہاں عمدگی
کے ساتھ موجود ہے۔''

ان مضامین کے علاوہ ڈاکٹر حسینی بوہرا کا مضمون ''مرزا غالب اوران کی ادبی خدمات'' ہے۔اس مضمون میں غالب کی زندگی اوران کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔یہ تنقیدی کم تعارفی نوعیت کا مضمون زیادہ ہے جس کا مقصد ہندی کے قارئین کو غالب کی ادبی خدمات سے متعارف کرانا ہے۔سمیترا نندن پنت کا مضمون ''غالب'' کو بھی اسی ضمن کی مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ نشکانت ٹھاکر کی دو تحریر ''مرزا غالب: بازیافت اور ایک خط'' اور ''غالب صاحب کو ایک خط'' کے عنوانات سے موجود ہیں۔نشکانت ٹھاکر نے پون کمار رما کی انگریزی کتاب ''غالب: دی مین، دی ٹائمس'' کا مراٹھی میں ترجمہ کیا ہے۔ان کی مذکورہ دونوں تحریریں کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ایک طرف جہاں انہوں نے غالب کی شاعری اور شخصیت کے چند اہم گوشے کی جانب اشارے کیے ہے وہیں دوسری جانب غالب کو ایک خط لکھ کر ان کی دلی اور اب کی دلی کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندی میں لکھے گئے مضمون کی نوعیت اردو سے مختلف ہے۔ ہندی ادیب سے غالب کو متعارف کرانے کا یہ ایک خوبصورت وسیلہ ہے۔غالب کی شاعری کو جب بھی بڑے کینوس میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے معنی کی پرتیں مزید کھلتی ہیں، غالب کی یہ خوبی ہے کہ بظاہر پامال نظر آنے والے مضامین کو بھی وہ نئی جہت عطا کرتے ہیں۔اپنا مضمون غالب کے اس شعر پر ختم کرنا چاہتا ہوں:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

○

رضی شہاب

پردۂ سیمیں پر غالب

مرزا غالب اردو کے ایسے فنکار ہیں جن پر ہر زاویہ سے غور وفکر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ظاہر ہے اس کی بنیادی وجہ ان کی شاعری، ان کا انداز فکر، زندگی کے تئیں ان کے نظریات اور ان کی شخصیت کی ہمہ جہتی رہی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے عہد زوال میں اپنی شاعری سے زندگی کے فلسفے سکھانے والا شاعر اپنے آپ میں انجمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عندلیب گلشن نا آفریدہ کی زندگی اور شاعری میں ہر قاری اپنے مطلب کے پہلو تلاش کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ زبیر رضوی مرحوم نے اپنی کتاب غالب اور فنون لطیفہ میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''کسی زبان کے کسی کلاسیکی شاعر یا کسی فن کار پر اس کے اپنے میڈیم کے علاوہ ترسیل کے دوسرے ذرائع ابلاغ میں ڈچ مصور وان گاگ کے بعد غالب دوسری شخصیت ہیں جن پر ہر پہلو سے اتنے ڈرامے لکھے گئے، ان پر فلم بنی، سیریل بنے اور بے شمار مصوروں نے ان کے مقبول اشعار کو پینٹ بھی کیا۔'' (غالب اور فنون لطیفہ، زبیر رضوی (مرتب)، ص۱۴)

اس مقالے میں میرا معاملہ غالب پر بنی فلموں اور ٹی وی سیریلس سے ہے۔ تاہم پہلے اس سوال پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے کہ غالب جیسی شخصیت فلمی دنیا سے وابستہ شخصیات کی دلچسپی کا

مرکز کیوں بنی؟ اگر اس کا جواب تلاش کریں تو جہاں تک میں سمجھ سکا اس کی بنیادی وجہ غالب کی خطوط ہیں۔ دراصل ان خطوط میں غالب کی زندگی کی ایسی تفصیلات موجود ہیں جو شاید اس عہد کے کسی اور شاعر یا ادیب کے بارے میں نہیں ملتی ہیں۔ ان کی شخصیت کے دلچسپ اور قدرے متاثر کن پہلوؤں کی کئی تصویریں ان کے خطوط میں دستیاب ہیں اور یہی دستیاب مواد فلموں میں ان کے کردار کو از سر نو خلق کرنے کے لیے فلم ساز کو آمادہ کرتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو غالب پر بننے والی فلموں اور ڈراموں کا پورا منظر نامہ ان کے خطوط میں موجود چند قصوں اور واقعات کے ارد گرد گھومتا ہے۔ زبیر رضوی کے لفظوں میں کہیں تو ''ایسا پہلی بار ہو رہا تھا کہ اپنے زمانے کا ایک بلند مقام شاعر اتنی بہت سی انسانی کمزوریوں اور قابل اعتراض حرکتوں کی بنا پر پولیس کے ہاتھوں دوبار پکڑا گیا اور جیل بھیج دیا گیا، گھریلو زندگی میں اس کا ایک ایسی منکوحہ سے سابقہ پڑا جو خاصی مذہبی اور خانہ ساز زندگی کے رکھ رکھاؤ کی عادی تھی اور جو زنان خانے اور مردانے کے درمیان حد فاصل بن کر سانس لینے والی زندگی جینے پر مجبور تھی۔ گھریلو اور دین دار امراؤ بیگم اور آزاد منش اور مے پرست شاعر غالب کے درمیان یہی ٹکراؤ و تضاد ناصح، واعظ کو ہدف بنانے اور ایک رند اور مے پرستی کی سرمستی کو برحق قرار دینے کا جواز بھی بن گیا۔'' غالب کی شخصیت کا یہ پہلو ان پر بنی تمام فلموں میں نمایاں طور سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غالب کی مجلسی زندگی کے پر کیف مناظر نے فلموں کا منظر نامہ بُنا ہے۔ شطرنج اور چوسر کی بازیاں، طوائف کی غزل سرائی، روز کی مے نوشی، قرض کی مے اور قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں ڈگری کا ہونا، قید و بند کی صعوبتیں، کوتوال شہر کا رقیب رو سیاہ بن جانا، ڈومنی سے عشق اور ناکامی، ۱۸۵۷ کے خوں ریز مناظر، سگے بھائی یوسف کا پاگل پن، سفر کلکتہ کی مشکلیں اور بے مراد واپسی، ضعیفی اور بہترین شاعری خلق کرنے کے باوجود ناکام شاعر کی سی زندگی جیتے ہوئے شہرت و عظمت سے سرفراز نہ ہونا، یہ غالب کی زندگی کے وہ پہلو ہیں جو ان پر بنی فلموں، ڈراموں اور ٹی وی سیریلس کا منظر نامہ تیار کرتے رہے ہیں۔

فلموں میں غالب کو کئی طرح سے استعمال کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ان کی غزلوں کو فلموں میں استعمال کیا گیا اور بعد میں چند ایک فلموں میں ان کی زندگی کی از سر نو تخلیق کی کوشش ہوئی۔ وہ کوششیں کتنی کامیاب ہوئیں یا پھر غالبیات کے ذیل میں ان فلموں کی کیا حیثیت ہے اس پر بات آگے ہوگی۔

پہلے ذکر ان فلموں کا جن میں غالب کی غزلوں کا سہارا لے کر فلم شائقین کو فلم دیکھنے پر آمادہ کیا گیا ہے۔ 1931 میں فلم عالم آرا کے ساتھ ہندوستانی میں بولتی فلموں کا دور شروع ہوا اور

1933 میں بننے والی فلم 'یہودی کی لڑکی' میں غالب کی غزل 'نکتہ چین ہے غم دل' شامل کی گئی۔ موسیقی پنکج ملک نے دی تھی اور آواز کے ایل سہگل کی تھی۔ 1939ء میں فلم 'غازی صلاح الدین' میں غزل 'کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے' شامل کی گئی جس کو مس کلیانی کی آواز میں موسیقار کھیم چند پرکاش نے ریکارڈ کیا تھا۔ 1941ء میں فلم 'معصوم' کے لیے منشی مبارک حسین نے اپنی موسیقی میں 'آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک' اپنی آواز میں ریکارڈ کروائی تھی۔ 1942ء میں فلم 'لالہ جی' میں موسیقار وسنت کمار نائیڈو نے وستالا کمیٹکر اور امر کی آواز میں غزل 'ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن' استعمال کی۔ فلم 'اپنا دیش' 1949ء میں بنی تھی جس کی موسیقی پرشوتم نے ترتیب دی تھی اور پشپا ہنس کی آواز میں 'کوئی امید بر نہیں آتی' اور 'دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے' شامل کی گئیں۔ 1950ء میں فلم 'کشمیر ہمارا ہے' میں طلعت محمود اور ثریا کی آواز میں موسیقار چشمے لہری نے غالب کی غزل 'دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے' کو شامل کیا ہے۔ 'ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے' گیان دت کی موسیقی میں جی ایم درانی نے گایا تھا اور فلم تھی 'گھائل' 1951 کا سال تھا۔ 1959ء میں راج کپور کی ایک فلم آئی تھی 'میں نشہ میں ہوں'، موسیقار تھے شنکر جے کشن اور اسے آواز دی تھی اوشا منگیشکر کی اور غزل تھی 'یہ نہ تھی ہماری قسمت'۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد 2005ء کی فلم 'ہزاروں خواہشیں ایسی' میں شانتا نو موئترا کی موسیقی اور شوبا مدگل کی آواز میں اسی غزل کو شامل کیا گیا۔ 2011ء میں شاہ رخ خان کی فلم آئی تھی ڈان 2، اس میں غزل 'یہ نہ تھی ہماری قسمت'، فلم بند کی گئی لیکن اسے شامل نہیں کیا گیا۔ 2013 میں فلم 'راجدھانی اکسپریس' میں 'کوئی امید بر نہیں آتی' کو لیا گیا، لاہو مادھو کی موسیقی میں شاہد مالیہ کی آواز میں ہندوستانی ورژن جبکہ ویسٹرن ورژن ہتیش پرشاد کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ 2015ء میں 'دل ناداں' کو فلم 'ہوائی زادہ' میں شامل کیا گیا، آواز تھی شویتا سبرام اور آیوش من کھرانا کی اور موسیقی بھی آیوش من کھرانا ہی کی تھی۔

یہ تو چند غزلیں ہیں جو فلموں میں استعمال کی گئیں۔ ان کے علاوہ اور بھی غزلیں ہوسکتی ہیں۔ یہاں ان غزلوں کا ذکر نہیں ہے جو فلموں میں استعمال نہیں کی گئیں البتہ موسیقی کی دنیا کے کئی ممتاز گلوکاروں نے ریکارڈ کیے ہیں۔

فلم سے وابستہ کئی شخصیات مرزا غالب سے متاثر ہوئیں اور غالب کو اپنے طور سے خراج عقیدت پیش کیا۔ اردو زبان کے مایہ ناز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی ایک ایسے ہی متاثرینِ

غالب ہیں۔ منٹو شاید پہلی شخصیت تھے جنہوں نے غالب پر فلمی کہانی لکھنے کے بارے میں سوچا۔ انہوں نے غالب پر لکھی گئیں کتابوں کو یک جا کر کے من چاہا غالب برآمد کرنے کے منصوبے پر کام کا آغاز کر دیا۔ ان کا غالب ایک خط کے فقرے میں مل گیا۔ "ستم پیشہ ڈومنی'' اور "دشمن کوتوال'' جیسے الفاظ نے منٹو کے تخلیقی ذہن کو مہمیز دے کر ایک ایسے غالب کو پیدا کر دیا جس نے تا حال اپنا عبوری اثر برقرار رکھا ہے۔ 'ستم پیشہ ڈومنی' اور 'دشمن کوتوال' کے کرداروں کو لے کر منٹو نے غالب کو اپنے مخصوص رنگ میں تخلیق کر ڈالا۔ قیاس ہے یہ کہانی 1942 کو صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو چکی تھی۔ لیکن فلمی صنعت سے وابستگی کے باوجود منٹو کو فلم ساز نہیں مل سکا جو اس کہانی کو فلمی پردے پر اتار سکے۔ آخر کار منٹو کی اسکرپٹ طاق کی زینت بن گئی اور ملک بٹتے ہی منٹو پاکستان چلے گئے۔ منٹو نے غالب پر فلم تحریر کرنے کے کئی پہلوؤں پر احمد ندیم قاسمی کے نام اپنے خطوط میں بات ہے۔ پچاس کی دہائی کے اوائل میں منٹو کا تخلیق کردہ غالب نابغۂ روزگار ہدایت کار اور تاریخی فلموں کے ماہر سہراب مودی کے ہاتھ لگا۔ انہوں نے باریکی سے اسکرپٹ پڑھنے کے بعد اسے فلمی پردے پر اتارنے کا اعلان کر دیا۔ اسکرین پلے جے۔ کے نندا نے تحریر کیا۔ جبکہ مکالمے تحریر کرنے کی ذمہ داری اردو زبان کے صاحبِ طرز افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی کو دی گئی۔ راجندر سنگھ بیدی نے اس وقت کی دہلوی زبان میں بہترین ادبی مکالمے لکھے۔ سہراب مودی نے غالب کے کردار کے لیے بھارت بھوشن کا انتخاب کیا جو تاریخی کرداروں کی ادائیگی میں یکتا تھے۔ 'ستم پیشہ ڈومنی' کے کردار کے لیے ملکۂ ترنم ثریا منتخب کی گئیں۔ ثریا کی اداکاری و گلوکاری کو اس زمانے میں فلم کی کامیابی کی سند مانا جاتا تھا اور موتی بیگم (چودھویں) کے روپ میں وہ اپنی چھاپ چھوڑ گئیں۔ غالب کی بیوی کے کردار کے لیے پرکشش نگار سلطانہ اور 'دشمن کوتوال' کا کردار باصلاحیت الہاس کے حصے میں آیا۔ دیگر اداکاروں میں درگا کھوٹے بطور ثریا کی ماں، مراد بطور مفتی صدر الدین، مقری بطور متھرا داس، حشمت خان، قم قم (یہ ان کی پہلی فلم تھی) اور افتخار بطور بہادر شاہ ظفر اہم ہیں۔ سہراب مودی نے اس فلم کی موسیقی کے لیے ممتاز فنکار نوشاد سے رابطہ کیا تھا۔ استاد محترم معین الدین جنابڑے نے سریندر پرکاش مرحوم کے حوالے سے ایک بار دوران گفتگو یہ بات بتائی کہ نوشاد ایک ساتھ ایک یا دو فلموں کے لئے ہی کام کرتے تھے۔ جب سہراب مودی نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے غلام محمد سے کام کرانے کا مشورہ دیا۔ غلام محمد نے غالب کی غزلوں کے لئے جس طرح کی دھنیں تیار کی وہ واقعی لاجواب تھیں۔

اس ٹیم نے انتہائی محنت اور جانفشانی سے منٹو کے غالب کو 'مرزا غالب' کے نام سے 1954 کو سینما اسکرین پر پیش کرنے کے لیے تیار کردیا۔ تاہم ذوالفقار علی زلفی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انڈین سینسر بورڈ نے فلم کو فحش قرار دے کر سرٹیفکیٹ دینے سے انکار کر دیا۔ سینسر بورڈ کے مطابق ثریا کا لباس فلم بینوں میں جنسی رغبت پیدا کرسکتا ہے کیونکہ اس لباس میں ان کے جسم کے خطوط نمایاں ہیں۔ وزارت اطلاعات سے بھی اجازت نہ ملنے پر ثریا نے سہراب مودی کو مشورہ دیا کہ جواہر لعل نہرو سے بات کریں۔ نہرو نے ان کی گزارشات سن کر فلم دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ فلم دیکھنے کے بعد انہوں نے مرزا غالب کو اسکرین پر دکھانے کی اجازت دے دی۔ 'مرزا غالب' ایک بلاک بسٹر فلم ثابت ہوئی۔ غالب کی غزلوں کو غلام محمد نے جہاں لازوال دھنوں سے نوازا وہاں ثریا نے انہیں وہ آواز دی کہ بقول غالب 'دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی'۔ اداکاری، موسیقی اور سینماٹوگرافی ہر لحاظ سے شاندار ہے۔ اس فلم کے بعد غالب برصغیر کے ہر گھر میں فروکش ہو چکے تھے۔ ان کی غزلیں ثریا کی وساطت سے ہر کان میں رس گھول کر معنی و مفہوم کے مختلف در کھول رہی تھیں۔

پاکستان میں غالب پر فلم بنی جس میں لالہ سدھیر نے غالب اور نور جہاں ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ یہ فلم 24 نومبر 1961 کو ریلیز ہوئی۔ فلم کی موسیقی تصدیق حسین نے ترتیب دی تھی۔ ہدایتکار اور پروڈیوسر کے فرائض ایم ایم بلومہرا نے انجام دیے تھے۔ یہ فلم سہراب مودی کی فلم کے مقابلے کم کامیاب رہی البتہ نور جہاں کی گائی ہوئی ایک غزل 'مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے' کسی حد تک عوام کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔

فلموں میں غالب کے اس سفر کا سارا منظر نامہ کیفی اعظمی کے سامنے تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ فرضی داستان کی جگہ ایک حقیقی اور معتبر مرزا غالب کو سینما اسکرین پر دکھایا جائے۔ ساٹھ کی دہائی کے وسط میں مہینوں کی شبانہ روز محنت کے بعد وہ غالب کی زندگی پر اسکرپٹ لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی کہانی 'ستم پیشہ ڈومنی' اور 'دشمن کوتوال' جیسے فقروں سے محفوظ تھی۔ کہانی لکھنے کے بعد انہوں نے متعدد مؤرخین و ناقدین کو اس کی کاپی بھیجی تا کہ غلطی کے امکان کو کم سے کم رکھا جا سکے۔ مگر ان کے سامنے بھی منٹو والے ہی چیلنجز تھے۔ فلم بنانے کے لیے ہدایت کار سکھ دیو نے رضامندی دے دی۔ مگر مسئلہ سرمائے کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب کے کردار کے لیے اشوک کمار، ان کی بیوی کے لیے مینا کماری اور ڈومنی کے کردار کے لیے ممتاز کو منتخب کیے جانے، موسیقی

کے لیے لیجنڈ فن کار مدن موہن کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود بھی معاملہ انجام تک نہ پہنچ سکا اور کیفی کا لکھا ہوا اسکرپٹ بھی فلم انڈسٹری کی دھول میں کہیں کھو گیا۔

اسی کی دہائی کے اوائل میں گلزار اپنے محبوب شاعر غالب سے قریب ہوئے۔ منٹو اور کیفی کے تخلیق کردہ غالب کے نمونے ان کے سامنے تھے۔ انہوں نے کیفی اعظمی اور اپنی تحقیق کے سہارے 1988 میں مرزا غالب کی زندگی پر مبنی ایک سیریل دوردرشن پر پیش کر دیا۔ یہ سیریل تقریباً 17 ایپسوڈ پر مشتمل تھا۔ اسکرپٹ گلزار نے تیار کیا اور ہدایت کاری کے فرائض بھی خود ہی انجام دیے۔ نصیرالدین شاہ کو مرزا غالب کا کردار دیا گیا۔ ان کی بیوی کے کردار کے لیے تنوی اعظمی (کیفی اعظمی کی بہو) اور طوائف کے کردار میں نینا گپتا کو چن لیا گیا۔ دیگر اداکاروں میں شفیع انعامدار نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کا کردار ادا کیا، بہادر شاہ ظفر کے کردار کے لیے سدھیر دلوی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پریکشت ساہنی نواب شمس الدین کے کردار میں نظر آئے۔ اب مسئلہ موسیقی کا تھا۔ غلام محمد جیسے استاد موسیقار کا متبادل تو خیر دستیاب نہ تھا لیکن ایک ایسے موسیقار کی اشد ضرورت تھی جو کم از کم غلام محمد کے قریب پہنچ سکے۔ بالآخر اس فریضے کی ادیگی کا ذمہ جگجیت سنگھ کو سونپ دیا گیا۔

فلم ناقدین اور شائقین کے مطابق نصیرالدین شاہ نے کمال کی اداکاری کی ہے۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس ٹیلی فلم کا مقابلہ غالب پر بنے ٹی وی کے دیگر ڈراموں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ ٹیلی فلم آٹھ گھنٹے طویل ہے اور 17 ایپی سوڈ میں دوردرشن پر شائقین کے لیے پیش کی گئی۔ اس میں غالب کی زندگی کو قدرے تفصیل سے فلمایا گیا ہے۔ بلاشبہ اس ٹیلی فلم پر گلزار کی محنت سے انکار مشکل ہے۔ اس کا سکرپٹ عمدہ تھا اور پھر مکالموں کا تو جواب نہیں۔ اداکاری میں نصیرالدین شاہ کے علاوہ نینا گپتا، شفیع انعامدار اور دیگر اداکاروں نے بھی اپنے فن کے خوب جوہر دکھائے۔ غالب کی ٹیلی فلم کی ایک اور خوبی جگجیت سنگھ کی گائی ہوئی غزلیں تھیں۔ جگجیت سنگھ اور ونود سہگل نیز چترا نے غالب کی غزلوں کو جن خوش کن سروں سے سجایا تھا وہ واقعی غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا۔ ان غزلوں نے اس ٹیلی فلم کی شان میں بہت اضافہ کیا۔ اس سیریل میں گلزار نے غالب کی زندگی کو جس خوبصورت انداز میں پیش کیا اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ غالب خواص کی محفلوں سے نکل کر اردو ادب کی تھوڑی شد بد رکھنے والوں اور اردو زبان سے محبت کرنے والوں کے حلقے میں بھی پہنچ گئے۔

اوپر مذکور فلموں اور ٹی وی ڈراموں کے علاوہ ہندستانی فلمی اداکارہ دیپتی نول نے برطانوی ٹی وی کے لیے غالب کی 6 غزلوں کو منتخب کر کے چھ قسطوں میں ایک سیریل بنایا تھا جس میں ہر غزل کو چار مختلف انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ سیریل کا نام تھا 'اے پلے فل ماؤز'۔ زی ٹی وی نے غالب کے حوالے سے کارٹون پر مبنی ایک فلم بنائی تھی۔

خلیق ابراہیم خلیق پاکستان کے ایک نامی دستاویزی فلم ساز تھے۔ انھوں نے غالب پر 80 منٹ کی ایک دستاویزی فلم بنائی۔ فلم کے تحقیق کار، رائٹر اور ہدایت کار وہ خود ہی تھے۔ اس فلم کو 1971 میں فلم اور اشاعت کے محکمے نے پروڈیوس کیا تھا۔ خلیل احمد نے اس کے لیے موسیقی دی اور اس کی دھنیں ان راگوں پر مبنی تھیں جو عہد غالب میں دلی میں عام تھیں۔ اس دستاویزی فلم کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ دستاویزی فلم مجھے دیکھنے کے لیے تو حاصل نہ ہوسکی کیونکہ یہ عوام کے لیے کبھی پیش نہیں کی گئی تھی۔ البتہ اس کے کچھ اسکرین شاٹس دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ اس فلم میں جوان غالب داڑھی کے بغیر تھا اور اس کی مونچھیں تھیں۔ جبکہ باقی تمام تر فلموں میں غالب داڑھی میں نظر آتے ہیں۔ اس فلم میں غالب کا کردار سجالی بایونس نے ادا کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے کئی ڈراموں میں غالب کا کردار ادا کیا۔

بینو راجپوت ایک فلم ساز ہیں۔ ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ ان کی بیشتر فلمیں آرٹ، کلچر اور ادب سے متعلق ہیں جو سماج کو سوچنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ انھوں نے غالب کی فارسی مثنوی ''چراغ دیر'' کو حوالہ بناتے ہوئے بنارس پر ایک دستاویزی فلم بنائی۔ اس فلم کا نام ''بنارس: کعبۂ ہندوستان'' ہے۔ یہ فلم غالب کے سفر بنارس سے متعلق ہے۔ یہ فلم 18-2017 میں بنائی گئی۔ اس فلم کو بینو نے مرزا غالب کو خراج تحسین قرار دیا ہے جو بنارس سے اس قدر متاثر تھے کہ اسے ہندوستان کا کعبہ تک کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس فلم کے لیے انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ تحقیق کے کام بھی کیے جس کا حوالہ وہ کئی پروگراموں میں دیتی رہی ہیں۔ تقریباً نو ماہ کی تحقیق کے بعد انھوں نے فلم کی شوٹنگ شروع کی۔ یہ فلم 30 منٹ سے زیادہ کے دورانیے پر مشتمل ہے۔

غالب کے مداحوں کسی خاص زمرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کے تمام تر شعبوں کے لوگوں نے غالب کو چاہا ہے اور اپنے طور پر انہیں خراج پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیرج پانڈے فلمی دنیا سے وابستہ کامیاب شخص ہیں۔ غالب سے متاثر ہونے والوں میں ان کا نام بھی

شامل ہے۔انھوں نے اپنے تحریری سفر میں مرزا غالب سے اثر قبول کیا۔اس بات کا اعلان وہ کئی محفلوں میں کر چکے ہیں کہ وہ نویں جماعت سے ہی مرزا غالب کی شاعری پڑھتے رہے ہیں اور ان کے مداح ہیں۔ان کا ناول ''غالب ڈینجر'' بھی اسی کا نتیجہ ہے۔جس کا اصل کردار غالب نام کا ایک شخص ہے۔اس ناول کو انھوں نے غالب کے اس شعر پر ختم کیا ہے:

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

پیوش مشرا ایک باکمال اداکار، تخلیق کار، نغمہ نگار اور گلوکار ہیں۔ غالب کے تئیں ان کی دیوانگی کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے اپنے میوزک بینڈ کا نام ''بلی ماران'' رکھا ہے۔ بلی ماران وہی جگہ ہے جہاں مرزا اسداللہ، نے مرزا نوشہ سے غالب تک کا سفر طے کیا اور جس کا نقشہ گلزار نے اپنے ٹی وی سیریل کے ڈرامے کے ابتدائیے میں کچھ اس طرح کھینچا ہے:

بلی ماراں کے محلّے کی وہ پیچیدہ دلیلوں کی سی گلیاں
سامنے ٹال کی نکڑ پہ بٹیروں کے قصیدے
گڑگڑاتی ہوئی پان کی پیکوں میں وہ داد وہ واہ واہ
چند دروازوں پہ لٹکے ہوئے بوسیدہ سے کچھ ٹاٹ کے پردے
ایک بکری کے ممیانے کی آواز
اور دھندلائی ہوئی شام کے بے نور اندھیرے
ایسے دیواروں سے منہ جوڑ کے چلتے ہیں یہاں
چوڑی والان کے کٹڑے کی بڑی بی جیسے
اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں سے دروازے ٹٹولے
اسی بے نور اندھیری سی گلی قاسم سے
ایک ترتیب چراغوں کی شروع ہوتی ہے
ایک قران سخن کا صفحہ کھلتا ہے
اسداللہ خاں غالب کا پتا ملتا ہے

یہ سب کچھ ہونے کے باوجود بھی غالبیات اور فلموں کے تعلق سے بات کرتے ہوئے ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر فلمیں بنتی کیوں ہیں؟ اس کے مقاصد کیا

ہوتے ہیں؟ ان کی کامیابی اور ناکامی انحصار کس پر ہوتا ہے اور کیا ان فلموں کا ادیب کی زندگی کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ ہوتا ہے؟ یہ فلمیں اگر نہ بنتیں تو کیا اس ادیب کی قدر دانی پر کوئی فرق آتا؟ اتنی بات تو حقیقت ہے کہ فلم ایک موثر ذریعہ ہے جس کا راست معاملہ عوام سے ہوتا ہے۔ عوام کو ذہن میں رکھ کر فلمیں بنتیں ہیں اور اُنہیں کی ذہنی سطح کو اور ان کی دلچسپیوں کو دھیان میں رکھ کر فلمی کردار تخلیق کیا جاتا ہے۔ جہاں تک بایو پک یا سوانحی فلموں کا معاملہ ہے ان میں ایک سو پچاس سے ایک سو استی منٹ کے اندر ایک فرد کی پوری زندگی کو سمیٹنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات بھی نہیں مگر یہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انھیں عناصر کو دھیان میں رکھ کر فلم ساز اپنے سبجیکٹ کی زندگی کے چند اہم واقعات، قصوں اور اس کی شخصیت کے بظاہر اُن نمایاں پہلوؤں کو اٹھاتا ہے جو عوام کے ساتھ اس کو وابستہ کرسکیں۔ ایسا کردار خلق ہوتا ہے جو عوام میں دلچسپ ہوتا ہے اور اسے عوام کی ہمدردیاں ملنے کی امید ہوتی ہے۔ بظاہر حقیقت کے ساتھ اس کا کوئی خاص کمٹمنٹ نہیں ہوتا۔ یہاں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ آخر فلمیں بنتی کیوں ہیں، فلموں کا بنیادی مقصد پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ اب وہ پیسہ کیسے کمایا جاسکے گا اسی پہلو کو دھیان میں رکھ کر فلم صنعت کام کرتی ہے۔ کردار کی شخصیت کے نمایاں پہلو منتخب کرنے کا معاملہ ہو یا پھر اس کے اندر موجود متنازع مسائل، موسیقی کی گنجائشیں تلاش کرنی ہوں یا پھر اداکاروں کے انتخاب کا معاملہ۔ سب کا انحصار اسی ایک مقصد پر ہوتا ہے کہ پیسہ واپس کیسے آئے گا۔ اتنی بڑی رقم جو فلم میں لگائی جاتی ہے اس کے لوٹنے کے اسباب فلم بنانے کے وقت تلاش کئے جاتے ہیں۔

فلموں کا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مرزا غالب فلم بنی۔ سہراب مودی نے فلم بنائی۔ اس فلم نے سہراب مودی کو بہت کچھ دیا۔ فلم کو پہلا قومی اعزاز ملا مگر کیا یہ فلم اس وجہ سے کامیاب ہوئی کہ غالب اس کا سبجیکٹ تھے؟ شاید نہیں۔ کیوں کہ یہ فلم دیکھنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی رہی ہوگی جو شاید غالب کو نہیں جانتے ہوں گے یا فقط نام سن رکھا ہوگا۔ البتہ یہ فلم دیکھنے پر مجبور کرنے والی چیزوں میں بھرت بھوشن کی اداکاری ہوسکتی تھی۔ جن کے چاہنے والے لا تعداد تھے۔ یہی نہیں بھرت بھوشن سے بڑھ کر تو ثریا تھیں جو اُن دنوں عوام کے دلوں پر راج کر رہی تھیں۔ پھر ان کی گائی ہوئی غزلیں بھی جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے جب یہ فلم دیکھی تو ثریا سے کہا کہ آپ نے تو غالب کی روح کو زندہ کر دیا۔ اس فلم کے مقبول ہونے کی ایک وجہ غلام محمد کی بنائی ہوئی دھنیں تھیں۔ اس فلم کی

کامیابی کی بنیادی وجہ یہ دھنیں بھی ہوسکتی ہیں۔مگر غالب نہیں کیوں کہ فلم میں غالب کتنا ہے؟فلم کا پورا منظرنامہ ستم پیشہ ڈومنی اور ظالم و جابر کوتوال کے اردگرد بنا گیا ہے۔غالب کی زندگی کے وہ بیشتر واقعات چھوئے بھی نہیں گئے جو ان کی زندگی کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔دراصل یہ اسی مجبوری کی وجہ سے ہے کہ فلم ساز کو پیسہ کمانے کے لئے من چاہا غالب بنانا تھا جو عوام کے دلوں پر اثر چھوڑ سکے۔مگر یہ بات بھی یادرکھنے کی ہے کہ عوام کی یادداشت بہت مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے۔

سہراب مودی کی فلم میں یا پھر گلزار کے ڈرامے میں زوراس بات پر رہا ہے کہ ایسا غالب خلق ہو جو صنعت فلم سازی کے لیے مضر نہ ثابت ہو۔ورنہ آخر بات کیا تھی کہ فلم اور ڈرامہ دونوں میں غالب کو صاحب داڑھی شاعر بنا کر پیش کیا گیا۔ظاہر ہے کہ فلم میں ایک مسلم شاعر کے کردار کو دوبارہ خلق کرنے کی کوشش ہوئی ہے اور ایک عام مسلمان کا تصور جو عوام کے ذہن میں ہے اس میں داڑھی کی اپنی معنویت ہے اور اسی لیے غالب کو اسی روپ میں فلمایا گیا ہے جبکہ غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ داڑھی انھوں نے بہت بعد میں رکھی۔وہ لکھتے ہیں:

''جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ملا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑ، منہ پر داڑھی، سر پر بال،فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈوایا۔لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔کیا بک رہا ہوں۔''(خطوطِ غالب: غلام رسول مہر،ص ۷۲۲)

گلزار کے ڈرامے میں البتہ ایک کمٹمنٹ یہ رہا کہ انھوں نے جب جگجیت سے غزلیں گنوانے کا فیصلہ کیا تو بات واضح کر دی کہ موسیقی ترتیب دیتے وقت اس بات کو دھیان میں رکھا جائے کہ موسیقی کے جو آلات عہد غالب میں رائج تھے انھیں کا استعمال ہو۔بعد میں اس کی علاحدہ ریکاڈنگ ہوئی تو اس میں موسیقی کے جدید آلات استعمال کیے گئے۔لیکن جہاں تک غالب کا ظاہری پیکر تراشنے کی بات ہے تو اس ڈرامے میں بھی غالب کو داڑھی کے ساتھ ہی دکھایا گیا ہے۔حتی کہ کہانی جہاں فلیش بیک میں چلتی ہے، غالب وہاں بھی سیاہ داڑھی میں ہی نظر آتے ہیں۔

ہوتے ہیں؟ان کی کامیابی اور ناکامی انحصار کس پر ہوتا ہے اور کیا ان فلموں کا ادیب کی زندگی کے ساتھ کوئی کمٹمنٹ ہوتا ہے؟ یہ فلمیں اگر نہ بنتیں تو کیا اس ادیب کی قدر دانی پر کوئی فرق آتا؟ اتنی بات تو حقیقت ہے کہ فلم ایک مؤثر ذریعہ ہے جس کا راست معاملہ عوام سے ہوتا ہے۔ عوام کو ذہن میں رکھ کر فلمیں بنتیں ہیں اور اُنہیں کی ذہنی سطح کو اور ان کی دلچسپیوں کو دھیان میں رکھ کر فلمی کردار تخلیق کیا جاتا ہے۔ جہاں تک بایو پِک یا سوانحی فلموں کا معاملہ ہے ان میں ایک سو پچاس سے ایک سو اسّی منٹ کے اندر ایک فرد کی پوری زندگی کو سمیٹنے کا کام ہوتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات بھی نہیں مگر یہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انھیں عناصر کو دھیان میں رکھ کر فلم ساز اپنے سبجیکٹ کی زندگی کے چند اہم واقعات، قصوں اور اس کی شخصیت کے بظاہر اُن نمایاں پہلوؤں کو اٹھاتا ہے جو عوام کے ساتھ اس کو وابستہ کر سکیں۔ ایسا کردار خلق ہوتا ہے جو عوام میں دلچسپ ہوتا ہے اور اسے عوام کی ہمدردیاں ملنے کی امید ہوتی ہے۔ بظاہر حقیقت کے ساتھ اس کا کوئی خاص کمٹمنٹ نہیں ہوتا۔ یہاں اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ آخر فلمیں بنتی کیوں ہیں، فلموں کا بنیادی مقصد پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ اب وہ پیسہ کیسے کمایا جا سکے گا اسی پہلو کو دھیان میں رکھ کر فلم صنعت کام کرتی ہے۔ کردار کی شخصیت کے نمایاں پہلو منتخب کرنے کا معاملہ ہو یا پھر اس کے اندر موجود متنازع مسائل، موسیقی کی گنجائشیں تلاش کرنی ہوں یا پھر اداکاروں کے انتخاب کا معاملہ۔ سب کا انحصار اسی ایک مقصد پر ہوتا ہے کہ پیسہ واپس کیسے آئے گا۔ اتنی بڑی رقم جو فلم میں لگائی جاتی ہے اس کے لوٹنے کے اسباب فلم بنانے کے وقت تلاش کئے جاتے ہیں۔

فلموں کا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مرزا غالب فلم بنی۔ سہراب مودی نے فلم بنائی۔ اس فلم نے سہراب مودی کو بہت کچھ دیا۔ فلم کو پہلا قومی اعزاز ملا مگر کیا یہ فلم اس وجہ سے کامیاب ہوئی کہ غالب اس کا سبجیکٹ تھے؟ شاید نہیں۔ کیوں کہ یہ فلم دیکھنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی رہی ہوگی جو شاید غالب کو نہیں جانتے ہوں گے یا فقط نام سن رکھا ہوگا۔ البتہ یہ فلم دیکھنے پر مجبور کرنے والی چیزوں میں بھرت بھوشن کی اداکاری ہو سکتی تھی۔ جن کے چاہنے والے لا تعداد تھے۔ یہی نہیں بھرت بھوشن سے بڑھ کر تو ثریا تھیں جو اُن دنوں عوام کے دلوں پر راج کر رہی تھیں۔ پھر ان کی گائی ہوئی غزلیں بھی جو لوگوں کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے جب یہ فلم دیکھی تو ثریا سے کہا کہ آپ نے تو غالب کی روح کو زندہ کر دیا۔ اس فلم کے مقبول ہونے کی ایک وجہ غلام محمد کی بنائی ہوئی دھنیں تھیں۔ اس فلم کی

کامیابی کی بنیادی وجہ یہ دھنیں بھی ہوسکتی ہیں۔ مگر غالب نہیں کیوں کہ فلم میں غالب کتنا ہے؟ فلم کا پورا منظر نامہ ستم پیشہ ڈومنی اور ظالم و جابر کوتوال کے اردگرد بنا گیا ہے۔ غالب کی زندگی کے وہ بیشتر واقعات چھوئے بھی نہیں گئے جو ان کی زندگی کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ دراصل یہ اسی مجبوری کی وجہ سے ہے کہ فلم ساز کو پیسہ کمانے کے لئے من چاہا غالب بنانا تھا جو عوام کے دلوں پر اثر چھوڑ سکے۔ مگر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عوام کی یادداشت بہت مختصر مدت کے لیے ہوتی ہے۔

سہراب مودی کی فلم میں یا پھر گلزار کے ڈرامے میں زور اس بات پر رہا ہے کہ ایسا غالب خلق ہو جو صنعت فلم سازی کے لیے مضر نہ ثابت ہو۔ ورنہ آخر بات کیا تھی کہ فلم اور ڈرامہ دونوں میں غالب کو صاحب داڑھی شاعر بنا کر پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ فلم میں ایک مسلم شاعر کے کردار کو دوبارہ خلق کرنے کی کوشش ہوئی ہے اور ایک عام مسلمان کا تصور جو عوام کے ذہن میں ہے اس میں داڑھی کی اپنی معنویت ہے اور اسی لیے غالب کو اسی روپ میں فلمایا گیا ہے جبکہ غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ داڑھی انھوں نے بہت بعد میں رکھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام ملا، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑ، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈوایا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ کیا بک رہا ہوں۔'' (خطوطِ غالب: غلام رسول مہر، ص ۲۲۷)

گلزار کے ڈرامے میں البتہ ایک کمٹمنٹ یہ رہا کہ انھوں نے جب جگجیت سے غزلیں گنوانے کا فیصلہ کیا تو بات واضح کردی کہ موسیقی ترتیب دیتے وقت اس بات کو دھیان میں رکھا جائے کہ موسیقی کے جو آلات عہد غالب میں رائج تھے انھیں کا استعمال ہو۔ بعد میں اس کی علاحدہ ریکاڈنگ ہوئی تو اس میں موسیقی کے جدید آلات استعمال کیے گئے۔ لیکن جہاں تک غالب کا ظاہری پیکر تراشنے کی بات ہے تو اس ڈرامے میں بھی غالب کو داڑھی کے ساتھ ہی دکھایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ کہانی جہاں فلیش بیک میں چلتی ہے، غالب وہاں بھی سیاہ داڑھی میں ہی نظر آتے ہیں۔

نصیرالدین شاہ نے غالب کا کردار نبھایا۔ ان کی اداکاری کو سراہا بھی گیا۔ تاہم کئی بار ان پر اس طرح کے بھی سوال اٹھے کہ وہ شعر کو صحیح ڈھنگ سے نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ کانوینٹ اسکول میں اپنی پوری تعلیم مکمل کرنے والے شخص کے بارے میں یہ اعتراض کوئی بے جا بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسی طرح کے ماحول میں علی سردار جعفری نے گلزار کے اس ڈرامے کا کچھ یوں دفاع کیا اور جو اس سیریل کے تعلق سے بہت اہم بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس ڈرامے کی خاص بات جگجیت کی موسیقی اور غالب کی غزلیں ہیں۔ یعنی یہاں بھی غالب کی غزلیں ہی کامیابی کا درواکر رہی ہیں۔

بلاشبہ ہر فن کار اپنی قدر ران خواص میں چاہتا ہے جو اس فن کی باریکیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ مصور کی تعریف تصویر سازی میں ماہر طبقہ کرے، مجسمہ سازی کی تعریف اس فن کے ماہر کریں اور شاعر وادیب کی تعریف، اس کے فن کی قدر دانی ادب وشاعری سے دلچسپی رکھنے والے، اس کی فہم رکھنے والے کریں تو بات بنتی ہے۔ شاعر قطعی اس بات سے دلبرداشتہ نہیں ہوسکتا کہ راہ چلتی ہوئی خلق خدا اس کے اشعار کی داد نہیں دے رہی مگر شعر وادب کی محفلوں میں اس کے فن کی قدر نہ ہو، یہ بات اس کے دل کو لگتی ہے۔ غالب کو اس بات کا دکھ نہیں ہوا کہ عوام ان کے اشعار کے معانی نہیں سمجھ رہی ہے لیکن جب شاہی دربار میں موجود شعرا میں ان کے اشعار پر واہ واہ کرنے والوں کی تعداد قابل لحاظ حد تک کم رہی تو ان کی شاعرانہ انا کو ٹھیس پہنچی اور وہ دربار چھوڑ کر نکل گئے۔

غالبیات کے اس پہلو کا کارنامہ اتنا ضرور ہے کہ اس نے غالب کو عوام کی صفوں تک پہنچا دیا۔ ان کی غزلوں کو گنگنانے کے موقع دیے اور غالب کی بہترین غزلوں کو خوش کن آوازیں دے کر عوام کے ذہنوں میں محفوظ کر دیا۔

○

ISBN 819434194-9
9 788194 341949



مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں